ہر عمر کے باذوق قارئین کے لیے دینی، علمی، فکری اور تفریحی تحریروں پر مشتمل ادبی پرچہ

ماہنامہ

قلم کا سفر

لاوہ

شمارہ نمبر 1 جلد نمبر 1، ربیع الثانی ۱۴۴۰ھ، دسمبر 2018ء

تمام عمر کی ایذا نصیبیوں کی قسم!
مرے "قلم کا سفر" رائیگاں نہ جائے گا

دینی، فکری اور تفریحی تحریروں پر مشتمل ادبی پرچہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجلّہ قلم کا سفر لاوہ

جلد، 1 شمارہ 1، ربیع الثانی ۱۴۴۰ھ، دسمبر 2018ء

اس ماہ کا آئینہ

علم و ادب کی تعلیم اور اخلاق کی تعمیر ہمارا نصب العین ہے

زیرِ سرپرستی: ملک صداقت حیات

زیرِ نگرانی: مفتی تنویر الطاف، محمد ابراھیم

مدیران
محمد عکاشہ نیازی، ابوالحسین آزاد

مجلسِ مشاورت: حارث قاضی، علی حیدر، عبدالودود احمد

رابطہ نمبر: 0302-5702763,0316-4074423

azadabulhusain1439@gmail.com

تحریریں بھیجنے کا پتہ: مولانا عبدالواحد، بگھی والی مسجد لاوہ، ضلع چکوال

ناشر: منیب الرحمٰن نظامی

تعارفی قیمت: -/15

قرآن کے سائے میں

"یاد رکھو! جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں میں بے حیائی پھیلے، اُن کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے، اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

(سورۃ النور: ۱۸)

حدیث کی روشنی میں

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "عنقریب لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جس میں اسلام کا صرف نام رہ جائے گا اور قرآن کے صرف نقوش باقی رہ جائیں گے۔ اُن لوگوں کی مسجدیں (ظاہری سجاوٹ کے اعتبار سے) تو آباد ہوں گی لیکن ہدایت کے اعتبار سے ویران ہوں گی۔" (رواہ البیہقی)

صبح صادق کے وقت کی دعا

اَللّٰھُمَّ بِکَ اَصْبَحْنَا وَ بِکَ اَمْسَیْنَا وَ بِکَ نَحْیَا وَ بِکَ نَمُوْتُ وَ اِلَیْکَ الْمَصِیْرُ

"اے اللہ! ہمیں آپ ہی کی توفیق سے صبح نصیب ہوئی، اور آپ ہی کی توفیق سے شام ملی۔ آپ ہی کی قدرت سے ہم جیتے ہیں اور آپ ہی کی قدرت سے ہم مریں گے اور آپ ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔"

(پُرنور دعائیں بحوالہ ترمذی)

سیلِ رواں

چھوٹا سا رسہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! ایک محاورہ ہے مٹھیاں بھینچنا۔ آپ بھی بھینچتے ہوں گے کبھی کبھی۔ مجھے تو یہ اکثر بھینچنی پڑتی ہیں۔ اس لیے کہ سردی زیادہ محسوس کرتا ہوں۔ مطلب یہ کہ میرے لیے یہ مفید ثابت ہیں۔

آپ حضرات سوچ رہے ہوں گے کہ مدیر صاحب بھی بہت دور کی کوڑی لائے۔ انہیں تو ہمیں اس رسالے کے اغراض ومقاصد سے آگاہ کرنا چاہیے تھا۔ آخر کو پہلا شمارہ ہے۔۔۔۔ آپ کی بات بجا۔ مجھے کرنا بھی یہی چاہیے تھا مگر پھر میں نے سوچا کہ یہ کام تو ابوالحسین آزاد صاحب مجھ سے بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔ میں ٹھہرا ''سیلِ رواں'' لکھنے والا جب کہ وہ آپ کو ذرا اچھے طریقے سے ''تلقین'' کریں گے۔

بہر حال بات ہو رہی تھی مٹھیاں بھینچنے کی۔۔۔۔ میں مٹھیاں اس وقت بھینچتا ہوں جب مجھ پر بے بسی طاری ہو جاتی ہے جس میں ادھر کا رہتا ہوں نہ اُدھر کا۔۔۔۔ اور یہ حالت مجھ پر مجلہ ''قلم کا سفر'' کے شمارہ نمبر ایک لیے موصول شدہ ڈاک کی چھان بین کرتے وقت غالب آئی۔۔۔۔ کچھ حضرات چونکہ نوآموز لکھاری تھے اس لیے ایڈیٹنگ کی ''چھری'' چلا کر ہم نے کافی قطع و برید کی۔۔۔۔ بات صرف کہانی کے پلاٹ یا مرکزی خیال کی نہ تھی اور نہ ہی مسئلہ صرف اور صرف الفاظ اور جملوں کے ربط میں تھا۔۔۔۔ بلکہ یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا۔ اردو کے استعمال میں اتنی غلطیاں تھیں کہ خدا کی پناہ۔۔۔ اکثر حضرات کا تو املاء ہی درست نہ تھا۔ گرامر کے حوالے سے بہت سی کمزوریاں دیکھنے کو ملیں۔ بعض لکھاریوں نے بہت زیادہ مشکل الفاظ استعمال کیے ہوئے تھے۔۔۔۔ اسی طرح الفاظ کو ملا ملا کر لکھنے کا رجحان بھی بہت زیادہ ہے۔ مثلاً کے لیے کو کیلئے لکھیں گے، اس میں کو اسمیں، کی طرف کو کیطرف، ایمان دار کو ایماندار وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔ مدیر جب دیکھتا ہے کہ اس کہانی میں اس قدر کانٹ چھانٹ کرنا پڑے گی اور اتنا وقت ضائع ہوگا تو وہ اسے رد کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔۔۔۔ اب خدانخواستہ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ آپ پیچیدہ الفاظ استعمال کرنا چھوڑ دیں۔۔۔۔۔۔۔ کریں۔۔۔۔۔ بلکہ اپنے ادب کو اور ''ٹھوس اور ثقیل'' بنائیں۔۔۔۔ مگر موقع محل کی مناسبت سے۔۔۔۔۔ اگر آپ کا قاری مالیدہ پسند کرتا ہے تو ''ٹھوس الفاظ'' کا سہارا لے کر اسے متنفر نہ کریں۔۔۔۔ امید ہے آپ اس جانب بھی توجہ فرمائیں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ چونکہ یہ ایک ادبی پرچہ ہے اور ہمیں آپ کی پسند، ناپسند کے مطابق اسے چلانا پڑے گا اس لیے اس میں صرف وہی تحریریں شائع کی جائیں گی جو آپ کو پسند ہوں، اچھی لگتی ہوں۔۔۔۔ اب آپ کو کیا پسند ہے، یہ تو آپ ہی بتائیں گے۔۔۔۔ اس لیے تمام قارئین سے گزارش ہے کہ رسالہ پڑھ کر کم از کم ایک خط ضرور لکھیں۔ رسالے میں موجود تحریروں پر تبصرہ کریں۔۔۔۔ اپنی پسند اور ناپسند بلاجھجک بیان کریں۔۔۔۔

مجلہ ''قلم کا سفر'' ادب کی دنیا میں ایک چھوٹا سا ''رسہ'' ہے۔ رسہ باندھنا ہمارا کام تھا، وہ ہم نے کر لیا۔۔۔۔ اب زور آپ لگائیں گے۔۔۔۔ دیکھتے ہیں آپ اس ''ادب کشی'' میں کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں؟ اور ہاں! اس مقابلے میں حصہ لینے کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں۔۔۔۔ آٹھ سے اسی سال تک کے ''بچے'' اس ''ادب کشی'' میں حصہ لے سکتے ہیں۔۔۔۔ جی ہاں!۔۔۔۔۔۔ اور آپ کو کیا چاہیے۔۔۔؟؟

محمد عکاشہ نیازی

تلقین

قلم کا سفر

ایک دن عکاشہ میرے پاس آیا اور پریشان اوراق کا ایک پلندہ میرے ہاتھ میں تھما کر کہنے لگا: ''نواز بھائی! یہ ہمارا ماہنامہ پھلجھڑی ہے، جو ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ ہمارے کمرے سے شائع ہوتا ہے۔اور وہ بھی صرف ایک نسخہ۔اس کا مطالعہ بھی کیجیے اور آئندہ کے لیے تحریر بھی عنایت فرمایئے۔اور ہاں! خاص الخاص نمبر شائع ہوگا۔عنوان ہے ''شرارتیں نمبر''

میں نے اس پلندے کی ورق گردانی کی تو ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریروں کا ایک معجونِ مرکب تھا۔میں نے اسے طفلِ مکتب کی شرارت سمجھ کر الماری کی نذر کردیا اور جان خلاصی کے لیے ایک عدد ہلکی پھلکی فکاہیہ (مزاحیہ) تحریر عکاشہ کے حوالے کردی۔لیکن حیرت کا جھٹکا اس وقت لگا جب دو تین ہفتوں کے بعد ٹائپ شدہ تحریروں کا اچھا خاصہ مجموعہ فائل کی شکل میں میرے ہاتھ آپہنچا۔ ''پھلجھڑی'' کا نام بدل کر ''سپیدۂ سحر'' ہوچکا تھا۔رنگین ٹائٹل پر مدیر کے عنوان کے تحت میرا نام بھی لکھا ہوا تھا۔جو بات میرے لیے سب سے زیادہ تعجب کا باعث بنی وہ تحریروں کی پختگی اور اسلوب پر کمال گرفت تھی۔واللہ باللہ کوئی تیس کے قریب تحریریں تھیں جن میں سے اکثر عکاشہ نے خود ہی فرضی ناموں سے لکھی تھیں۔باقی تمام تحریریں بھی چونکہ نوآموز لکھاریوں نے ہی لکھی تھیں لہذا ان کی قطع و برید اور تہذیب کا کام بھی موصوف نے اس کمال اور مہارت سے کیا کہ جواب نہیں۔

پھر اس سے بڑھ کر ہر تحریر کی ابتدا میں دو چار سطریں لکھاری کے تعارف میں ایسی لکھی ہوئی تھیں کہ اصل سے بھی زیادہ لطف انہیں پڑھنے میں آتا ہے۔مثلاً موصوف نے ایک لکھاری کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

'' عاطف صاحب ایک بہت بڑے موسیقار ہیں۔ مرحوم مہدی حسن کے زمانے میں پیدا ہوتے تو ان کی ٹکر کے سنگر ہوتے۔ ہر وقت منہ ہی منہ میں کچھ نہ کچھ بڑبڑاتے رہتے ہیں۔گنگناتے گنگناتے ایک کہانی لکھ ماری جسے پڑھ کر آپ بھی گنگنااٹھیں گے۔تو پڑھیے اور گنگنایئے کہ یہی زندگی ہے۔ (مدیر)''

سپیدۂ سحر کے شروع میں جو اداریہ لکھا ہوا تھا مبالغہ آرائی سے قطعِ نظر میرا یہ دعویٰ ہے کہ اشتیاق احمد مرحوم آج زندہ ہوتے اور یہ تحریر ان کے سامنے پیش کرکے کہا جاتا کہ آپ نے چند سال قبل ''بچوں کا اسلام'' میں یہ ''دو باتیں'' لکھی تھیں تو امید واثق یہی ہے کہ مان لیتے۔پھر اس سے بھی بڑی بات یہ کہ موصوف نے سارا کام تن تنہا سرانجام دیا اور مدیران کی فہرست میں ''برائے برکت'' ہمارا نام بھی تحریر فرمادیا۔

یہی وہ محرکات تھے جنہوں نے بالآخر راقم السطور کو اس بات پر اکسایا کہ سنجیدگی کے ساتھ برادر اصغر کی سرپرستی میں، اس رسالے کو منظرِ عام پر لایا جائے اور ہر ماہ اسے باقاعدگی سے جاری کیا جائے۔ہم نے مشورے کے ساتھ نام تبدیل کرکے ''قلم کا سفر'' رکھ دیا ہے۔یہ احمد فراز کے اس مشہورِ زمانہ شعر سے ماخوذ ہے:

مجھے تمام عمر کی ایذا نصیبیوں کی قسم
مرے "قلم کا سفر" رائیگاں نہ جائے گا

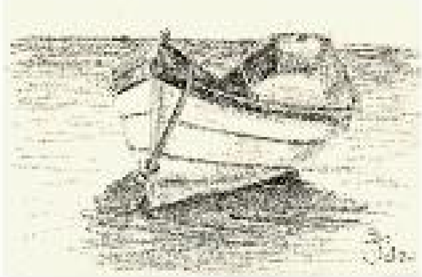
آخر میں میں عکاشہ کے ہی یہ الفاظ نقل کر آپ سے اجازت چاہوں گا جو اس نے "سپیدۂ سحر" کے اداریہ میں لکھے تھے:

"ایک سوال مجھ سے اکثر کیا جاتا ہے کہ آپ اس (سپیدۂ سحر) کا کیا کریں گے؟ بعض خیر اندیش اور بہی خواہ تو مشوروں پر اتر آتے ہیں بلکہ مشورے سے زیادہ ڈر بٹھاتے ہیں۔

ایک دفعہ ہمدرد نونہال کی مجلس شوریٰ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ حکیم محمد سعید اور مسعود احمد برکاتی موجود تھے کہ اچانک اکاؤنٹینٹ "ہمدرد نونہال" نے ایک رجسٹر حکیم صاحب کے سامنے رکھا۔ "یہ کیا ہے"؟ انھوں نے دریافت کیا۔ "سر! یہ ہمدرد نونہال کا حساب کتاب ہے۔ عملہ کی تنخواہوں وغیرہ کا حساب میں نے لگایا ہے۔ اس حساب سے یہ رسالہ کئی لاکھ کا خسارہ اٹھا رہا ہے، مسلسل نقصان میں ہے، آپ اسے بند کروا دیں کیوں کہ کوئی فائدہ نہیں"۔ اکاؤنٹینٹ نے مقدمہ پیش کیا۔ "بس! یا اور کچھ؟ آپ بچوں کے اس رسالے سے حاصل ہونے والے منافع کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ آگے چلیے (مطلب یہ کہ کوئی اور بات کیجیے۔)"

واقعہ آپ نے پڑھا امید ہے آپ وہ سمجھ گئے ہوں گے جو میں آپ کو سمجھانا چاہتا تھا۔ اب آپ اس ماہ کا شمارہ پڑھیے اور اپنی آراء سے نوازیے۔ شکریہ"

نیازمند:
ابوالحسین آزاد



سائبان اٹھ گیا۔۔

حنظلہ۔ سکا

تبلیغی جماعت کے امیر حاجی عبد الوہاب صاحب رحمہ اللہ کے سانحہء ارتحال پر لکھا جانے والا نثری مرثیہ

"تبلیغی جماعت کے امیر حاجی عبدالوہاب صاحب انتقال کر گئے ہیں۔تمام طلبہ سے گزارش ہے کہ ایک دفعہ سورۃ الفاتحہ اور تین دفعہ سورۃ اخلاص پڑھ کر ان کو ایصالِ ثواب کر دیں۔"

نماز کے بعد مفتی صاحب کے اس اعلان نے سب پر سکتہ طاری کر دیا اور ہر آنکھ ان کا سانحہء ارتحال سن کر نمناک ہو گئی،اس دارِ فانی سے جانا تو ہر ایک نے ہے لیکن کچھ لوگ اپنی ذات کے اعتبار سے ملت ہوتے ہیں اور اپنے جانے کے بعد ایسا مہیب خلا چھوڑ کر جاتے ہیں جو شاید ان کے بعد کبھی پر نہیں ہوتا۔

حاجی صاحب ۱۹۲۳ء میں ہندوستان کے شہر دہلی میں پیدا ہوئے۔ان کا تعلق راجپوت برادری سے تھا۔دینی ذہنیت کے حامل اور پنجگانہ نماز کے پابند تھے،اس کے ساتھ ساتھ ہر ایک کو نماز کی دعوت دینا بھی ان کا ایک اہم مشن تھا۔ جوانی میں مجلسِ احرار کے رکن رہے اور اپنی ملازمت کا آغاز تدریس کے شعبے سے کیا،اپنے طلبا کو بھی نماز کی ترغیب دیتے، ان کی نماز سنتے اور درست کرتے تھے۔

یکم نومبر ۱۹۴۴ء کو حاجی صاحب کی ملاقات مولانا الیاس رحمہ اللہ سے ہوئی۔حاجی صاحب نے مولانا کو امت کی فکر میں حقیقی طور پر تڑپتے پایا اور جب حاجی صاحب نے چھ ماہ تک مولانا کی قربت اٹھائی تو ان میں اس صحبت کا اتنا اثر ہوا کہ قدرت نے ان کے دل میں بھی امت کے لیے غم اور تڑپ پیدا کر دی۔

استقلالِ پاکستان کے بعد انہوں نے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی اور یہاں آ کر اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور پھر یہیں سے گریجویشن کی ڈگری حاصل کی۔تعلیم سے فراغت کے بعد تحصیل دار کے عہدے پر فائز ہوئے۔جو کہ اس زمانے میں ایک اہم عہدہ تھا۔لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ تحصیل دار کا یہ عہدہ ان کے تبلیغ کے کام میں رکاوٹ ڈال رہا ہے تو انہوں نے اس عہدے سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا اور بعد میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تبلیغ سے منسلک ہو گئے اور

اپنی ساری زندگی اسی کام کے لیے وقف کردی۔

حاجی صاحب سے پہلے تبلیغی جماعت کے امیر مولانا شفیق اور حاجی بشیر صاحب تھے۔۱۹۹۲ء میں یہ تبلیغی جماعت کے امیر بنے اور پھر تا حیات اس عظیم کام کی سرپرستی بڑی جانفشانی، اخلاص، تندہی اور ذمہ داری سے انجام دیتے رہے۔ اگرچہ وہ پہلے بھی تبلیغ سے منسلک تھے مگر امیر بننے کے بعد تو ان پر تبلیغ کا حال طاری ہوگیا۔ان کی ہر بات دعوت ہوتی، وہ تبلیغِ دین کا ایک چلتا پھرتا اشتہار تھے،ان کی شخصیت کا سب سے بڑا امتیاز وہ نبوت والی تڑپ اور فکر تھی جس نے عمر بھر ایک لمحے کے لیے بھی انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔اسی طرح اللہ تعالی کی غیبی طاقتوں پر انہیں ایسا یقین، اعتماد اور بھروسہ تھا ہوئے تھے۔جو صرف اور صرف اللہ کے خاص بندوں کا شیوہ ہوا کرتا ہے۔ بلا مبالغہ وہ صحابہ کے یقین و ایمان کا ایک وافر حصہ اپنے اندر جذب کیے ان کا ایک خاص مقولہ تھا جس پر انکا عقیدہ لوہے پہ لکیر کی طرح تھا:

"اللہ سے سب کچھ ہوتا ہے مخلوق سے کچھ نہیں ہوتا"

ایک سروے کے مطابق حاجی صاحب اسلامی دنیا کے ۵۰۰ با اثر ترین افراد میں دسویں نمبر پر تھے۔لیکن اس کے باوجود عجز و انکساری کا یہ عالم تھا کہ مشہور صحافی خالد فاروق کہتے ہیں کہ "میں ۱۹۹۲ء میں تبلیغی جماعت کے ساتھ نکلا اور رائیونڈ میں قیام کیا۔ایک رات قضائے حاجت کی غرض سے بیت الخلا کی طرف گیا تو وہاں ایک سفید ریش بزرگ بیت الخلا کی صفائی کر رہے تھے،قریب جا کر دیکھا تو پتا چلا کہ یہ تو امیر تبلیغی جماعت حاجی عبدالوہاب صاحب ہیں۔"

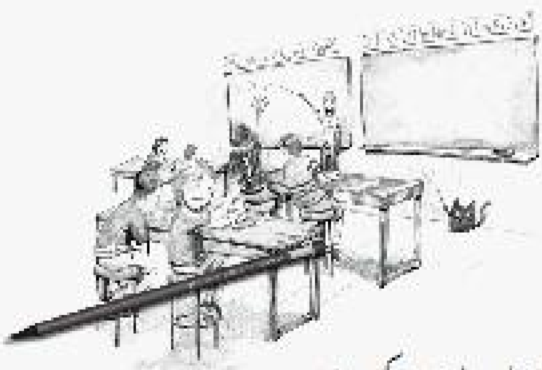
حاجی صاحب امت مسلمہ کے ان نایاب عبقری راہنماؤں میں سے ایک تھے جن کا نفس وجود ہی ہزاروں فتنوں کے آگے بند اور لاکھوں برکتوں کے نزول کا سبب تھا۔ بڑی شخصیات کے انتقال کے موقع پر یہ کہنے کا ایک رواج سا بن چکا ہے ان جیسا شخص صدیوں میں پیدا ہوگا۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ حاجی صاحب للّٰہیت اور فکر امت کے اس مقام پر کھڑے تھے جہاں تک رسائی حاصل کرنا فرد کے لیے تو دور کی بات پورے معاشرے کے لیے بھی محال ہے۔

عجز و انکساری اور توکل کا یہ پیکر ۱۸ نومبر کی صبح ڈاکٹر ہسپتال لاہور میں اسی دارِ آخرت کی طرف کوچ کر گیا جس کی طرف بلاتے بلاتے اور اس کی فکر دلاتے دلاتے اس نے اپنی پوری زندگی صرف کردی۔

۱۹ نومبر کی صبح رائیونڈ مرکز میں مولانا خورشید صاحب نے حاجی صاحب کی وفات کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا:

"ہمارے سروں سے سایہ اٹھ گیا۔"

رحمه الله رحمة واسعة، اللهم لا تحرمنا اجره، ولا تفتنا بعده۔



چراغوں میں روشنی

امیر اللہ ۔ تحصیل جنڈ

جب دروازے کی درز سے جھانک چکنے کے بعد ہمیں استاد صاحب کی عدم موجودگی کا یقین ہو گیا تو جھٹ سے کلاس میں داخل ہو گئے اور بینچ پر بیٹھتے ہی سکون واطمینان کا ایک لمبا سانس لیا۔ ہماری حالت یوں تھی جیسے کوئی چور اپنی چوری کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔ کچھ دیر توقف کے بعد وسیم کندھے فخر سے چوڑے کر کے کہنے لگا: ''دیکھا! میں نے کہا تھا! صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔'' اور ہم سر ہلا کے رہ گئے کہ ایک اور دن خیریت سے گزر گیا۔

یہ ہمارا پانچواں دن تھا کہ ہم تفریح (break) کے بعد کلاس میں آدھ گھنٹہ تاخیر سے آ رہے تھے۔ ہمارے استاد محترم ماشر اللہ دتہ صاحب کسی وجہ سے رخصت پر تھے۔ چونکہ ان کے تین پیریڈ ہماری کلاس میں تھے، اس لیے ہماری خوب موجیں ہو گئیں۔ دن بھر کلاس میں خوب اچھل کود کرتے، کبھی کبھار سوئے رہتے، پارٹیاں اڑاتے اور اس کے علاوہ

زمانۂ طالب علمی کی معصوم شرارتوں کا دل نشیں تذکرہ

ایک نزدیکی پارک میں تفریح کے مزے بھی لوٹ لیتے۔ پارک کیا تھا! ایک ٹوٹے ہوئے جھولے، پندرہ فٹ کی کھردری سلائیڈ اور ایک عدد نیم کے بوڑھے درخت پر مشتمل اس ایک مرلے کی اراضی کو ''پارک'' کا نام دیا گیا تھا۔ کچھ کچھ زردی مائل گھاس بھی موجود تھی اس لیے چند بکریاں بھی ہماری طرح اِدھر کا رخ کرتیں۔ بکریاں تو پیٹ کا دوزخ بھرتیں اور ہم جھولے جھولتے تتلیاں پکڑتے اور کلاس میں بیٹھے بیٹھے جو ''تھکان'' لاحق ہو جاتی تھی، اس کا ازالہ کرتے۔ میں اور وسیم روزانہ ہی یہاں آتے جب کہ باقی کلاس وہیں درسگاہ میں بیٹھ کر مزے اُڑاتی۔ ہماری واپسی پر ہمارے کلاس فیلو ہم پر جملے کستے اور ہمارے انتخاب کی خوب بے آبروئی کرتے مگر ہمارا ایک ہی جواب ہوتا:

؎ اہلِ ذر ہنستے ہیں میرے دامنِ صد چاک پر
اور میں نازاں ہوں اپنی فطرتِ بے باک پر

چونکہ ہمیں ماسٹر اللہ دتہ صاحب کی چھٹی کے ایام کی تعداد معلوم نہ تھی اس لیے چار دن مزے لوٹنے کے بعد جب پانچویں دن ہم کلاس میں داخل ہونے لگےتو ہمارے دل میں ہول اُٹھ رہا تھا۔ہم ڈر رہے تھے کہ شاید ماسٹر جی کلاس میں موجود ہوں مگر وسیم برابر ہمیں تسلیاں دیے جا رہا تھا۔خدا کا کرم ہوا کہ ماسٹر صاحب کلاس میں نہ تھے۔

چھٹے دن وسیم کلاس سے غیر حاضر تھا تو ہم نے ''پارک'' جانے کا پروگرام منسوخ کر دیا مگر پھر ہمارے دوستوں نے ہمیں اتنا زچ کیا کہ ہم بادلِ نخواستہ ''پارک'' کی جانب چل دیے۔حسبِ معمول دو تتلیاں پکڑیں، تین بار جھولے سے گرے، بکریوں کے پیچھے بھاگے اور آدھ گھنٹہ گزار کر خراماں خراماں چلتے واپس آ لیے۔

ہم واپس جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئے ہمارے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے،اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔اگلا منظر ہی عجیب تھا۔ماسٹر اللہ دتہ صاحب اپنی کرسی پر بیٹھے مولا بخش ہاتھ میں تھامے ہوئے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔

دیکھتے ہی کہنے لگے:''آیئے۔۔۔صاحب زادے۔۔۔۔۔۔آیئے۔۔تشریف لایئے۔''

اور پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

(بقیہ ''مختصر'') بولی : ''عبدل!۔۔۔!عبدل۔۔۔۔!''

عبدل نے پھر پوچھا:''مارو کیسی ہے؟''دائی چند ساعتوں بعد دبے لہجے میں بولی:''عبدل! تمہارا بچہ اور بیوی دونوں مر گئے۔''یہ سن کر وہ کسی بچے کی طرح بلک بلک کر رونے لگ گیا۔لیکن بین کرنے سے،رونے سے مرنے والے کہاں زندہ ہوتے ہیں؟ بس دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔اس کو ایسا لگنے لگا کہ ایک بار پھر اس پر زمین و آسمان تنگ کر دیے گئے ہیں۔اس کی روح پر قیامتِ صغریٰ برپا ہو چکی تھی۔انسان پر قیامت کبریٰ سے نجانے زندگی میں کتنی قیامتیں برپا ہوتی ہیں اور انہی قیامتوں سے اس کی روح کتنی بار مرتی ہے اور پھر ایک دن اس کا جسم ان دنیاوی جھنجھٹوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور شاید اسی کا نام موت ہے۔اس دنیا میں اگر کسی کی روح ایک ہی بار میں مر جائے تو اسے اپنے جسم کی پروا نہیں رہتی بس اسے انتظار ہوتا ہے اپنے روح سے خالی وجود کے مرنے کا۔لیکن انتظار ہمیشہ سخت ہوتا ہے موت سے بھی زیادہ شدید۔کون جانے کتنا وقت گزرے گا تو انسان کو منوں مٹی تلے دفنایا جائے گا یا پھر جلا کر کسی سمندر یا دریا میں پھینک دیا جائے گا۔

چند گھڑیوں بعد عبدل کو اپنی حقیقی دنیا کا ہوش آیا اور اس نے بھاگ کر اپنے بیوی بچے کو کفن میں لپیٹا اور ریڑھی پر ڈال دیا۔شہر کی بڑی گلی سے گزرتے ہوئے اس کو چند مسلح اشخاص ملے جن میں سے ایک نے اس سے پوچھا:''اوئے۔۔۔۔۔!عبدل کہاں رہتا ہے؟''عبدل چپ رہا۔دوبارہ سوال دہرانے پر اس نے جواب دیا: ''وہ شاید قبرستان میں رہتا ہے۔روز مردے دفناتا ہے۔''انہوں نے اسے پاگل سمجھا اور آگے چل دیے پھر وہ شہر سے باہر قبرستان کی طرف جانے والی سڑک پر چل پڑا کہ اپنی روح، اپنی بیوی اور بچے کو دفن کر لے۔



سوات دنیا کے حسین ترین سیاحتی مقامات میں سے ایک ہے۔ ۱۹۷۰ء تک یہ ایک الگ ریاست تھی۔اس کا ایک مستقل نظامِ حکومت، قانون اور دستور تھا۔۱۹۷۰ء میں جب صدر جنرل ایوب خان نے سوات کے والی (بادشاہ) کو اسے پاکستان میں شامل کرنے کی فرمائش کی تو خونی رشتہ داری اور قرابت کی وجہ سے والیءسوات کے لیے جنرل ایوب خان کی اس فرمائش کے آگے انکار کی کوئی گنجائش نہ تھی۔اور پھر دونوں حکمرانوں کے باہمی اتفاق کی بدولت ۱۹۷۰ء میں یہ خوبصورت اور دل نشیں خطہ پاکستان کا حصہ بن گیا اور باضابطہ طور پر سوات کا پاکستان سے الحاق ہو گیا، یوں اب یہ پاکستان کے اضلاع میں سے ایک خوبصورت ضلع کہلاتا ہے۔

پاکستان کا سوئیزرلینڈ

پاکستان کے خوبصورت سیاحتی مقام کا تذکرہ وہیں کے رہائشی کی زبانی

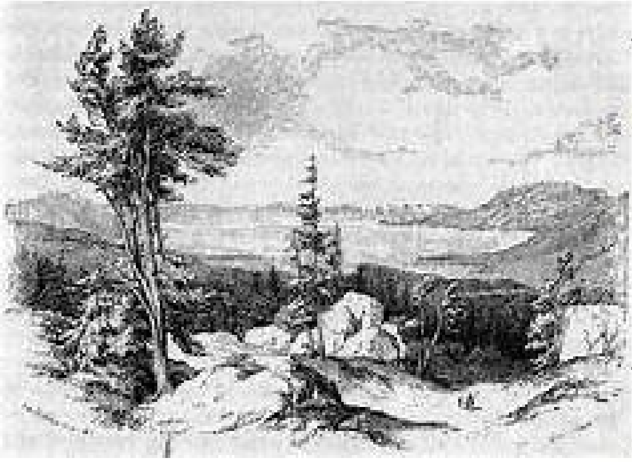
محمد زیاد احمد ۔ سوات

غیرملکی سیاح حضرات کئی صدیوں سے سیروسیاحت کی غرض سے یہاں کا رخ کرتے نظر آتے ہیں ۔حتیٰ کہ ایک دفعہ برطانیہ کی ملکہ الزبتھ نے بھی سوات کا دورہ کیا، وہ یہاں کے فطری حسن، خوبصورتی، دیدہ زیب نظاروں، رعنائی، تازگی اور دلفریبی سے اس قدر حیران اور متاثر ہوئیں کہ اپنی اس حیرانگی کا اظہار والیءسوات سے ملاقات کے دوران ان الفاظ میں کیا:

''SAWAT IS SWITEZRLAND OF ASIA.''

''سوات تو ایشیا کا سوئیزرلینڈ ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے سوات کو حسن وجمال کی نعمتوں سے مالامال کر رکھا ہے۔ہرے بھرے جنگلات، برف پوش چوٹیاں، ٹھنڈے میٹھے چشمے، شور مچاتی ندیاں، نالے اور آبشاریں، تندوتیز دریا، سرسبز وادیاں، خشک میواجات اور طرح طرح کے انمول خزانے قدم قدم پر نگاہِ شوق کو دعوتِ نظارہ دیتے نظر آتے ہیں۔یہاں انواع واقسام کے پھل بکثرت پائے



جاتے ہیں جن میں آڑو اور جاپانی پھل دنیا بھر میں مشہور ہیں۔سوات کے شہرہءِ آفاق سیاحتی مقامات میں وادیءِ کالام، مالم جبہ، مہوڈنڈ، بحرین اور مدین سرفہرست ہیں۔مالم جبہ میں ہر سال برف رانی (sking) کا مقابلہ ہوتا ہے جس میں تقریباً چودہ ممالک شریک ہوتے ہیں۔سوات کی ''چار باغی ٹوپی'' بھی ایشیا بھر میں لوگوں کے سروں پر ڈولتی نظر آتی ہے۔

یہاں کی ایک مشہور سوغات ''Trout fish'' ہے۔یہ انتہائی لذیذ اور خوش ذائقہ مچھلی ہے۔جو دور سے ہی لوگوں کو دسترخوان پر کھینچتی ہے۔اس کی نایاب خصوصیت یہ ہے کہ یہ صرف اور صرف ٹھنڈے پانی کے چشموں میں پائی جاتی ہے۔اس میں ریڑھ کی ہڈی کی علاوہ ایک کانٹا بھی نہیں ہوتا۔اس بنا پر یہ کافی مہنگی بھی ہوتی ہے مگر پھر بھی لوگ سوات کی ٹھنڈی شاموں میں آگ کے سامنے بیٹھ کر اسے بھنبھوڑتے نظر آتے ہیں۔گویا سارا سوات ہی مچھلی کھا رہا ہے۔۔۔۔

(بقیہ ''میرا جرم کیا ہے؟'') کہ وہ لڑکی کمک لیے پہنچ چکی تھی ۔۔اودھر سے کئی ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے تیزی سے میری جانب بڑھے اور زور سے طمانچے رسید کیے، میں اس وقت تو نہ سمجھ پایا کہ میرے بائیں کان سے کیا نکلا لیکن بعد میں چھوٹی بہن سے معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ وہ دھواں تھا۔۔۔مین نے طمانچے تو کھا لیے لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میرا جرم کیا تھا۔۔۔؟؟ مظلوم کی مدد کرنا جرم تھا۔۔۔؟؟ اپنے بھائی کی فریاد رسی کرنا گناہ تھا۔۔۔؟؟؟ حالاں کہ ممتاز مفتی کے بقول:

''ہمارے چھوٹے چھوٹے اللہ واسطے کے بغض، چھوٹے چھوٹے لاگ، چھوٹے چھوٹے لگاؤ، چھوٹی چھوٹی بے وجہ دشمنیاں، چھوٹی چھوٹی ناراضگیاں، چھوٹی چھوٹی غلط فہمیاں، کج رویاں، یہ سب ایک عام شریف آدمی کے لیے چھوٹی چھوٹی لذتیں ہیں۔۔۔غریبانہ عشرتیں ہیں، معصوم عیاشیاں ہیں، یہ وہ کھونٹیاں ہیں جن پر دوستی کی گٹھڑیاں ٹانگی جاتی ہیں۔''

شاید آپ کو میرا جرم سمجھ میں آگیا ہو۔میں تو ابھی تک ورطہءِ حیرت میں پڑا ہوا ہوں۔آپ ہی میری مدد کیجیے۔۔۔۔۔۔۔

ہمارے معاشرے کے امیر طبقے کی بہت سی خوشیاں غریبوں کی آہوں اور ہچکیوں کا صدقہ ہیں۔ سوچیے اگر غریب اپنے غموں کا حساب لینا شروع کریں تو امیر طبقے کو کتنا بھاری تاوان ادا کرنا پڑے گا؟ ایک ایسی کہانی جو آپ کی آنکھیں بھگو دے گی۔



برکھا

افضل تتری ۔ اختر کالونی

شمی کی نظر آسمان پر پڑی۔ آسمان کالے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ موسم بھی ابر آلود تھا۔

''لگتا ہے آج ضرور بارش ہوگی۔ مجھے فون کر کے مشی کو بلانا چاہیے۔'' شمی بڑبڑائی اور فوراً اندر رکھے ٹیلی فون کی طرف بھاگی:

''ہیلو! ہیلو!۔۔۔۔ مشی کیا کر رہی ہو؟'' نمبر ملتے ہی وہ بول اٹھی۔

کچھ بھی تو نہیں۔۔ تم سناؤ۔۔'' مشی کی آواز سنائی دی۔

''کچھ خاص نہیں۔ مگر سنو۔۔۔۔۔۔ موسم کچھ اچھا ہو رہا ہے اور شاید بارش بھی ہو جائے۔ اس لیے یہیں آجاؤ۔ مل کر انجوائے کریں گے۔۔۔'' شمی بولتی چلی گئی۔

''اچھا!۔۔۔ ٹھیک ہے۔ میں آؤں گی مگر پہلے نذیراں سے کہو گی کہ پکوڑے تیار رکھے گی۔''

''اچھا بھئی!۔۔۔ میں کہہ دیتی ہوں۔ تم اب آ بھی جاؤ۔'' شمی اکتا کر بولی۔

''آہا۔۔۔ اب کیوں نہیں نذیراں کے ہاتھ کے پکوڑے بارش میں وہ مزہ دیتے ہیں جو۔۔۔۔'' مشی بول رہی تھی کہ شمی نے جھلا کر ریسیور رکھ دیا: ''ہونہہ۔۔۔ چٹوری کہیں کی۔۔۔'' وہ بڑبڑائی اور صحن میں بے چینی سے ٹہلنے لگی۔

اچانک بارش کی ایک بوند اس کے چہرے پر گری۔ اس نے اپنے گداز گالوں پہ ہاتھ پھیرا اور چلائی:

''آہا!۔۔۔ بارش۔۔۔۔۔۔۔'' وہ مچل اٹھی اور باہر کھڑی ہو کر بارش سے لطف اندوز ہونے لگی۔ وہ لاکھ ماڈرن گھرانے کی سہی مگر بارش دیکھ کر اندر کی دیہاتی لڑکی اچھل اٹھتی۔ وہ بارش انجوائے کر رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔

☆☆☆☆

سیما نے دروازہ کھولا تو باہر اس کا باپ سائیکل لیے کھڑا تھا۔ سیما نے اس کے ہاتھ سے سبزی کا شاپر لیا اور پانی لینے چل دی۔

''ابا! ۔۔کیا ہوا؟ پریشان کاہے کو نظر آتے ہو؟'' سیما نے باپ کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر دریافت کیا۔ کرم دین نے اپنے سر سے صافہ اتار کر چارپائی پر رکھا اور پھر سرد آہ بھر کر بولا:

''بیٹی! چودھری صاحب نے نہر کے کٹاؤ کا حکم دے دیا ہے۔ اب مجھے ڈر ہے کہ سیلاب ہمارے گاؤں کا رخ کرے گا۔ اب دیکھ!۔۔۔تیرے لیے اتنی مشکل سے جہیز اکٹھا کیا، مجھے تو اس کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ اگر سارا سامان بہ گیا تو ہمارا کیا بنے گا؟''

''تو فکر نہ کر ابا! اللہ بڑا مسبّب الاسباب ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی راہ کھول دے گا۔''

''ارے ہاں!۔۔۔ میں یہ سامان منشی کو دے کر آتا ہوں۔۔۔۔۔ وہ تو ویسے بھی چودھری حشمت کی حویلی میں ہوتا ہے۔ ادھر کون سا سیلاب نے رخ کرنا ہے۔'' کرم دین بولا۔

☆☆☆☆

''اے مشی! تھوڑا اور اونچا ناں۔۔۔۔ تجھ سے جھولا بھی نہیں دیا جاتا۔۔۔۔۔'' دونوں اب نیم کے درخت کے نیچے پینگ بندھوا کر جھولے جھول رہی تھیں۔ ''ارے مشی! تجھے سیما یاد ہے؟''

''کون سی سیما؟۔۔۔''

''وہی تو ہمیں جھولے دیا کرتی تھی۔''

''اف کتنا اونچا دیا کرتی تھی۔۔۔'' شمی نے توبہ کے انداز میں ہاتھ کانوں کو لگائے۔ جھولا ڈولنے لگا۔

''آرام سے بیٹھی رہو۔۔'' مشی غرائی۔ ''ہاں۔۔۔ہاں!۔۔۔وہی سیما، تجھے معلوم ہے اگلے ماہ اس کی شادی آ رہی ہے؟ چلوگی ناں؟'' مشی نے پوچھا۔

''ہاں۔۔۔ہاں ابا ایک دفعہ نہر کے کٹاؤ کا حکم دے لیں۔ ارے ہاں! اس کے گاؤں کا نام کیا تھا؟۔۔۔ہاں۔۔۔حکم آباد۔ ابا بھی تو وہیں کٹاؤ ڈال رہے ہیں۔'' مشی بولی۔

اچانک نذیراں کی آواز سنائی دی: ''لڑکیو! آجاؤ۔ پکوڑے تیار ہیں۔'' آواز سنتے ہی شمی نے پینگ پر سے چھلانگ لگا دی

اور دونوں خراماں خراماں چلتیں باغ میں امرود کے درخت کے پاس سے گزریں تو شمی کہنے لگی: ''مشی یاد ہے ایک بار ہم سب گھر والوں سے نظر بچا کر اس درخت پر کچے امرودوں کے لالچ میں چڑھ گئے تھے۔''

''ہاں ۔۔۔۔۔۔یاد ہے۔۔۔۔۔۔اور یہ بھی کہ تمہارے بھائی نے ''سانپ سانپ'' کہہ کر ہمیں ڈرایا تھا اور ہم نے خوف کے مارے چھلانگیں لگا دیں۔'' مشی بولی۔

''میرا بھائی۔۔۔۔۔۔تمہارا بھی تو کچھ لگتا ہے؟'' شمی ہنس کے بولی تو مشی جھینپ گئی۔

''پکوڑے مزے کے ہیں۔'' مشی نے چٹخارا بھرتے ہوئے کہا۔ ''نذیراں کے ہاتھ کے پکوڑے اور مزے کے نہ ہوں۔'' شمی بولی، وہ دونوں کھلکھلا اٹھیں اور دروازے کی درز سے جھانکتے چودھری حشمت خان نے مسکرا کر انہیں دیکھا: ''جیتی رہیں ہمیشہ۔۔۔۔'' اور پھر وہ نہر کے کٹاؤ کا حکم دینے کے لیے منیجر کو فون کرنے لگے۔

☆☆☆☆

نہر کا کٹاؤ ڈل چکا تھا۔ سیلاب آیا تھا مگر سامان محفوظ رہا۔ کرم دین نے رات کو ہی منشی کے پاس رکھوا لیا تھا۔ اس تدبیر سے سامان تو بچ گیا مگر جس کے لیے بچایا گیا تھا وہ نہیں بچی۔ سیما گھر میں اکیلی تھی۔ جب سیلاب اسے بہا کر لے گیا۔ کرم دین آنسو بہا رہا تھا۔ شمی اور مشی بھی تعزیت کے لیے گئی تھیں:

''چاچا! غم کی بات نہیں، اللہ کا مال تھا، اس نے لے لیا۔'' مشی نے بڑے بوڑھوں کی نقل اتارنے کی کوشش کی۔

''بیٹا! تم کیا سمجھو!!! شاید تمہارے باپ کو نہیں معلوم کہ نہر کا کٹاؤ کتنا عذاب لایا۔۔۔۔تمہارے باپ نے میری بیٹی کے بدلے تمہاری خوشیاں خریدی ہیں۔'' کرم دین خلا میں گھورتے ہوئے بولا۔

شمی نے مشی کا ہاتھ پکڑا اور بولی: ''چھوڑو! لگتا ہے جوان بیٹی کی وفات کا گہرا اثر ہے، وگرنہ پاپا تھوڑا سا ہی سیلاب ہی تو لائے تھے۔ وہ بھی انہوں نے پہلے اطلاع دی تھی۔ اب یہ خود اپنی حفاظت نہ کر سکے تو پاپا کا کیا قصور ہے!!!''

''ٹھیک کہتی ہو۔۔۔'' مشی نے اس کی تائید کی۔

اچانک ڈرائیور نے ہارن بجایا: ''بی بی! جلدی کرو، دیر ہو گئی تو چودھری صاحب مجھ پر برسیں گے۔ ویسے بھی موسم خراب ہو رہا ہے۔''

وہ دونوں جلدی سے کار میں آ بیٹھیں۔ اچانک بارش کی پہلی بوند گاڑی کی ونڈ سکرین پہ گری۔

''آہا!۔۔۔بارش۔۔۔''مشی چلا اٹھی۔ ''چلو پھر گھر جا کر پکوان بنواتے ہیں۔'' شمی بولی اور وہ دونوں کھلکھلا اٹھیں۔

گاڑی آگے بڑھ گئی۔ دونوں پگلیاں نجانے کب سمجھیں گی کہ جھونپڑیوں پر برسنے والی بارش کوٹھیوں پر برسنے والی بارش سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔۔۔۔۔ٹھنڈی، تلخ اور بے رحم۔۔۔۔۔

بار بار توہینِ رسالت کا ارتکاب کیوں؟

''اہلِ مغرب کو شاید یہ اندازہ ہو چکا ہے کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی ذات سے مسلمانوں کی وابستگی اتنی گہری اور مضبوط ہے کہ اس طرح کی جزوی کاوشوں سے اس کو کم کرنا یا ختم کرنا بڑا دشوار ہے۔ اسی لیے وقتاً فوقتاً توہین کے واقعات کا ارتکاب جان بوجھ کر کیا جاتا ہے۔ کبھی فضول کتابیں لکھوائی جاتی ہیں کبھی کارٹون چھاپے جاتے ہیں۔ یہ سب مظاہر جان بوجھ کر ایک ایک کرکے پیش کیے جاتے ہیں تاکہ مسلمانوں کے دل میں جذبہ ٹھنڈا پڑ جائے اور آہستہ آہستہ لوگ ان چیزوں کو دیکھنے کے عادی ہو جائیں۔ برائی اگر بار بار ہوتی رہے تو لوگوں کی نظروں میں پھر وہ برائی نہیں رہتی۔''

(ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ: محاضراتِ سیرت ﷺ ص: ۵۹۷)

آنے والے شمارے کی متوقع تحریریں

☆سنہرا ماضی (اسلامی تاریخ کے حسین گلدستے سے منتخب کیے جانے والے واقعاتی اور تذکاری پھول)

☆نیوٹن کا تعاقب (نیوٹن سے سینکڑوں سال قبل مسلمان سائنس دان حرکت کے تینوں قوانین دریافت کر چکے تھے جن کا تذکرہ آج بھی ان کی کتابوں میں موجود ہے، ابن سینا، امام رازی، ابن الہیثم اور ھبۃ اللہ بغدادی کی کتابوں کے مستند حوالوں سے مرصع ایک حیرت انگیز سائنسی انکشاف)

☆بچوں کے مشہور ادیب پروفیسر مرزا اسلم بیگ کا مدیر ''قلم کا سفر'' کے متعلق تحریر کردہ مضمون۔

☆زلزلے کی موت (ان کے گھر میں تقریباً ہر روز زلزلہ آتا تھا، پھر کچھ ایسا ہوا کہ وہ زلزلہ مر گیا۔ ایک دلچسپ کہانی، افضل تتری کی زبانی)

☆مستقبل کا سفر (سو سال بعد دنیا کیسی ہوگی؟ ایک دلچسپ ناولٹ، حارث قاضی کے قلم)

☆بزمِ شعروسخن (ہر ماہ قدیم اور جدید شاعری سے حسین انتخاب، نیز نو آموز شعراء کا نو تصنیف کلام)

☆کچھ سمجھ آئی؟ (ہر ماہ اردو کے منتخب الفاظ و محاورات کا درست تلفظ، معنی اور استعمال)

اور وہ سب کچھ جو آپ اس شمارے میں دیکھنا چاہتے ہیں

معلومات کا خزانہ

محمد فرحان ۔ چکڑالہ

۱۔انسانی ناک عمر بھر میں پینتالیس پونڈ خاک چھانتی ہے۔

۲۔انسان کی پنڈلی وہ واحد ہڈی ہے جو دو ہزار پونڈ وزن اٹھا سکتی ہے مگر ٹوٹتی نہیں۔

۳۔پانامہ سال میں دو مرتبہ تین نومبر اور اٹھائیس نومبر کو آزادی کی سالگرہ مناتا ہے۔

۴۔جبوتی کی پولیس صرف چار افراد پر مشتمل ہے۔

۵۔عوامی جمہوریہ چین وہ واحد ملک ہے جہاں پولیس بالکل نہیں۔

۶۔اسپین کے گاؤں میں رہنے والے ہر شخص کے ہاتھ اور پاؤں کی سات انگلیاں ہوتی ہیں اور ان کے چھ چھ پورے ہوتے ہیں۔وہ پانچ انگلیوں والوں کو عجیب سمجھتے ہیں۔

۷۔ہندوستان کی ریاست کے مہاراجہ مان سنگھ نے پندرہ سو شادیاں کیں۔

۸۔افریقہ کے شہر میگازا میں تمام مکانات نمک سے بنے ہوئے ہیں۔

۹۔آسٹریلیا کے جنگلات میں بکرے مچھلیاں کھاتے ہیں اور درختوں پر بھی چڑھ جاتے ہیں۔

۱۰۔ویسٹ انڈیز وہ واحد ملک ہے جس کا دارالخلافہ نہیں ہے۔

۱۱۔جاپان میں بچے کے پیدا ہوتے ہی اس کی عمر نو ماہ شمار کی جاتی ہے۔

۱۲۔ملکہ نور جہاں برصغیر کی مشہور مسلمان ملکہ تھی،جس نے پندرہ ہزار لاوارث لڑکیوں کی شادیاں کرائی تھیں۔

۱۳۔سگریٹ دنیا میں سب سے زیادہ بکنے والی چیز ہے۔

۱۴۔ڈنمارک وہ واحد ملک ہے جس کا ہر مرد اور ہر عورت پڑھی لکھی ہے۔

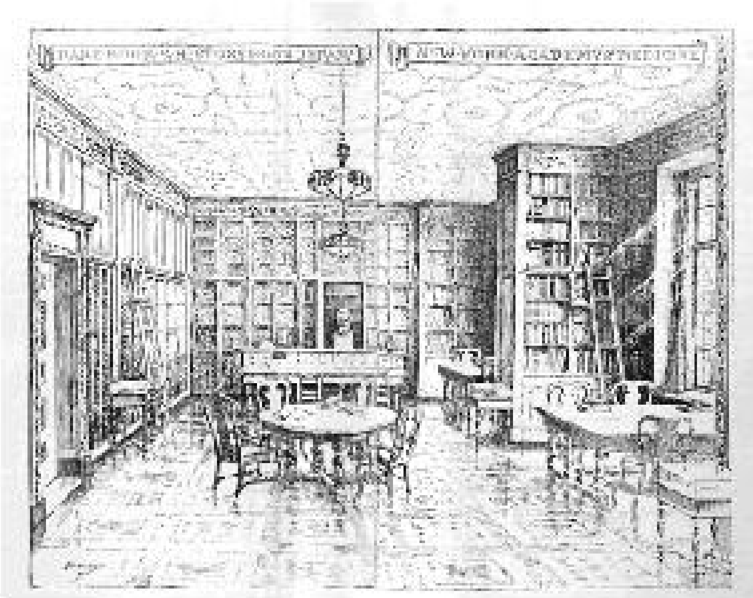
۱۵۔بندر ایک ایسا جانور ہے جس کے دو دماغ ہوتے ہیں۔

۱۶۔اونٹ دو ماہ تک پانی پیئے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔

۱۷۔سانپ دو سال تک کھائے پیئے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔

۱۸۔بلی اپنی زندگی کا دو تہائی حصہ سو کر گزارتی ہے۔

میرا ایک دوست مجھے وہاں لے آیا تھا۔ ہر طرف سے گرد آلود بدبو کے بھبکے اڑ رہے تھے۔ دیواروں کا پلاسٹر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ لکڑی سے بنے دروازے میں کچھ ایسے مخروطی شگاف تھے جیسے اماوس کی رات میں کئی چڑیلوں نے آپس میں چیخنے کا، مقابلہ لگایا ہو۔ اور تختۂ مشق اس دروازے کی درزنی ہو۔ اور انہی فلک شگاف چیخوں کے نتیجے میں جو لکڑی کا برادہ گرا تھا اس سے وہ الماری بنا دی گئی تھی جس



آسیب زدہ

اختر عالم ۔ افضل کالونی

ایک ایسی داستان جس میں لکھاری نے ماضی اور حال کے فاصلوں کو چار لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔

کی جانب میرا دوست مجھے پکڑ کر لے آیا تھا۔

یہاں آنے کی کہانی بھی عجیب تھی پرسوں ذاکر میرے پاس آیا اور کہنے لگا: ”یار سمیر بہت دن ہوئے ہم کہیں باہر نہیں گئے۔ میں نے ایک جگہ ڈھونڈی ہے پرسوں تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“

تیسرے دن وہ میرے سامنے تھا۔ میں نے اس کا ساتھ دیا اور ہم دونوں موٹر سائیکل پہ بیٹھ گئے۔ چند گلیاں، دو چوک، تین خستہ حال چوبارے اور ایک کھلی سڑک پار کرنے کے بعد ہم ایک عمارت کے سامنے تھے۔ عمارت کیا تھی ایک کمرے کے اوپر دوسرا کمرا رکھ کر اسے ”ڈبل سٹوری بلڈنگ“ کا نام دے دیا گیا تھا۔ اوپر دھندلی روشنائی سے لکھی ہوئی پلیٹ لگی ہوئی تھی کافی غور کرنے کے بعد مجھے یرقان زدہ ”یادگار میوزیم“ لکھا ہوا نظر آیا۔

”آؤ اندر چلیں تمہیں کئی حیرت انگیز چیزیں دیکھنے کو ملیں گی۔“ ذاکر کی آواز نے میری توجہ عمارت پر لگی نیم مردہ پلیٹ سے ہٹائی۔ ”اوں ہوں اچھا۔۔۔“ میں ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے اندر داخل ہو گیا۔ پوری بلڈنگ میں اندھیرے

کا سماں تھا ایک زیرو وولٹ کا بلب اس یرقان زدہ ماحول کو مزید زردی مائل کر کے اس کی خوفناکی میں اضافہ کر رہا تھا۔ مجھے چند ٹوٹی پھوٹی چٹائیاں، مٹی کے کٹورے، ''کھلونے'' چار پانچ چھینکے، آرائشی بیلیں، کچھ کتابیں اور بھربھری مٹی کے بنے تین گھڑے نظر آئے۔ جن پر جلی حروف میں مدھم سا ''اتحاد، تنظیم اور یقین'' لکھا نظر آ رہا تھا۔ میں ابھی آنکھیں جھپکا ہی رہا تھا کہ ذاکر نے میرا بازو مروڑا: ''اوں ہوں ــــــ اوپر چلو ـــــ''

ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئے۔ وہاں ہر چیز پر گرد کی انچ انچ موٹی تہہ چڑھی نظر آ رہی تھی۔

ذاکر اور میں اب اس اکلوتی اور خستہ حال الماری کے پاس کھڑے تھے۔ اچانک ذاکر نے اس الماری کا پٹ زور دار انداز میں کھولا۔ الماری جھنکتے ہوئے کھلی اور لکڑی کا کچھ جما ہوا برادہ اوپر سے نیچے آ گرا۔ اندر تین طاقچے نظر آ رہے تھے جو تھے تو لکڑی کے بنے ہوئے مگر اب ان سے لکڑی کا کھرنڈ اتر چکا تھا۔ اور اب لکڑی کھوکھلی بن چکی تھی۔

طاقچوں کے اوپر بھی کچھ کندہ تھا جو مدھم ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آ رہا تھا میں نے انگریزی ادب کی عینک اتار کر یونانی فلسفے کی عینک سے دیکھا تو ''شعبۂ اطفال'' لکھا ہوا نظر آیا۔ پڑھنے کے فوراً بعد میں نے انگریزی ادب کو دوبارہ آنکھوں پہ سرکا لیا۔ اچانک ذاکر نے اس گوشے کے اندر ہاتھ ڈالا اور ایک گرد آلود کتاب نکالی جس کی خستہ حالی کے پیش نظر اسے اب تک دیمک لگ جانا چاہیے تھا۔ نہ لگنے کی وجہ اندر موجود نیم کا پتہ تھا جو ذاکر کے صفحے پلٹنے پر نیچے گر پڑا۔ میں نے اسے اٹھایا اور طاقچے میں رکھ دیا اس وقت تک ذاکر سرورق جھاڑ چکا تھا۔ میں نے دیکھا اس کے اوپر لکھا تھا ''بچوں کے پسندیدہ مشغلے'' ذاکر نے پہلا صفحہ پلٹا۔ فہرست میں کتب بینی، شعر گوئی، کبڈی، کوڈی کوڈی، گل گھرا وغیرہ وغیرہ لکھے نظر آئے۔ میں فہرست دیکھ کر گھبرا گیا، اور یہ گھبراہٹ ہر پلٹتے صفحے کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جا رہی تھی میں نے بوکھلا کر جیب سے قلم نکالا، فہرست کے عنوان ''بچوں کے پسندیدہ مشغلے'' میں لفظ ''پسندیدہ'' کو کاٹ کر اس کی جگہ پر ''متروک'' تحریر کر دیا۔ میں نے کتاب ذاکر کو تھمائی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا عمارت سے باہر نکل آیا۔

(بقیہ ''القدس'') ویران پڑی ہوتی ہے۔ اس کے اردگرد الو بول رہے ہوتے ہیں۔ اور دنیا کی مردود و مبغوض قوم وہاں نہتے مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ ڈھا رہی ہوتی ہے۔ ٹینک، گن شپ اور ہیلی کاپٹروں سے مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہائی جا رہی ہوتی ہیں ــــ مگر اپنی عشرت و مستی کے خول سے سر باہر نکالنا گوارا نہیں کرتے۔

پتہ نہیں وہ صبح کب طلوع ہوگی جب صلاح الدین ایوبی کا کوئی وارث اٹھے گا اور القدس کی سرزمین کو صیہونیت کے پنجوں سے چھٹکارا دلا کر ابدالآباد کے لیے اپنے نام کو زندہ و جاوید کر جائے گا۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔



منتظر

علی حیدر - گلستان کالونی ٹیکسلا

"مارو! مجھے جانا ہوگا اور تمہیں بھی میرے ساتھ جانا ہوگا۔"

عبدل نے جب ماریہ سے یہ کہا تو ماریہ نے پہلے تو کوئی ردِعمل ظاہر نہ کیا۔ لیکن جب اس نے دوسری بار یہی جملے دہرائے تو مارو کی آنکھ سے ایک اشک گر کر اس کے رُخسار پہ یوں اٹک گیا جیسے شبنم پھول پر۔

اپنا وطن، اپنا دیس ہر کسی کو عزیز ہوتا ہے چاہے وہ جانور ہو، پرندہ ہو یا انسان اسے چھوڑنا آسان نہیں ہوتا ہے اس دھرتی سے جتنے بھی زخم سہنے پڑیں سہہ لیے جاتے ہیں۔ عبدل کی فراست کا چرچا دور دور تک پھیلا ہوا تھا اور اسی فراست کی بدولت وہ بادشاہ کا سپہ سالار مقرر ہوا تھا عبدل کی شادی کو ابھی چند دن ہی گزرے تھے کہ اس کو میدانِ جنگ کا رُخ کرنا پڑا۔ دشمن ملک نے عبدل کے ملک پر حملہ کر دیا اور وہ اپنی نئی نویلی دلہن، جس کی مہندی کا رنگ بھی نہ چڑھا تھا، کو چھوڑ کر چلا گیا۔ دشمن کے ساتھ جب گھر کے بھیدی بھی مل جائیں تو تقدیر کا رُخ ایسا پلٹتا ہے کہ کوئی تدبیر بھی کارگر نہیں ہوتی۔ خوشیوں نے مارو کے آنگن میں ابھی قدم رکھے تھے کہ جیسے غم انہی کی تاک میں بیٹھا تھا اور گھر کی دہلیز سے خوشیاں اتنی دور چلی گئیں کہ ایسے لگنے لگ گیا کہ شاید مارو کی زندگی میں پھر کوئی خوشی نہ آئے گی۔

جنگ میں سپہ سالار کی ہر تدبیر ناکام ہوگئی۔ وزیر نے بادشاہ کے ساتھ دھوکا کیا۔ شاہی خاندان کو ایسی شکست ہوئی کہ پوری سلطنت ہل گئی۔ جنگ میں جب آنکھوں کے سامنے نئی نویلی دلہن اور خوابوں سے پُر بنا بسا ہوا گھر آ جائے تو تلوار ہاتھ سے گر جاتی ہے، گھوڑوں کی ٹاپوں سے نفرت اور بستر عزیز ہو جاتا ہے۔ عبدل کا لشکر تتر بتر ہو گیا اور خود شہر میں آ کر روپوش ہو گیا۔ اس کی حالت اب پہلے سے بگڑ چکی تھی۔ بظاہر جسم پر اتنے زخم نہ تھے لیکن اس کی روح کا وجود نا رہو چکا تھا۔ اب وہ بھیس بدل کر شہر میں جاتا اور اسی گشت میں اس کی ملاقات چند پرانے ساتھیوں سے ہوتی۔ یہ عبدل کے خاص لوگ تھے اور انہی کی بدولت عبدل کو بادشاہ کی موت کی خبر ملی۔ یہ لوگ رات کے پچھلے پہر عبدل کے گھر ملتے اور دن بھر کی خبریں ایک دوسرے کو دیتے۔ عبدل کے پاس وسائل بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھے کہ وہ دوبارہ اپنی کھوئی ہوئی طاقت بحال کر سکے۔

ادھر عبدل کو خود سے زیادہ مارو کی فکر ہونے لگی کہ اگر اسے کچھ ہو گیا تو مارو کو نجانے زندگی کن کانٹوں کے سنگ گزارنی ہوگی۔ عبدل کو خبر ملی کہ وزیر کے جاسوس شکاری کتوں کی طرح اسے ہر جگہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس خبر پر وہ اور پریشان ہو گیا۔ انسان چاہے کتنا ہی عقل مند کیوں نہ ہو ایک نہ ایک دن عقل حالات سے مغلوب ہو جاتی ہے۔ ہر تدبیر ناکام ہو جاتی ہے اور اس وقت صرف خدا تعالیٰ کی ذات کا سہارا بچ جاتا ہے۔

دکھ اور غم اگر بتا کر کسی دالان میں یا کسی سلطنت میں داخل ہوتے تو شاید ان سے نپٹنے کا کوئی حل نکال لیا جاتا۔ مارو کی زندگی میں دکھوں اور غموں نے خاموشی سے دستک دی اور آکے ڈیرا ڈال دیا۔ وہ عبدل کے سامنے مسکراتی رہتی لیکن ہر مسکراہٹ اور قہقہے کے پیچھے کچھ آنسو ہوتے ہیں اور وہ یہ آنسو تنہائی میں بہاتی۔ اپنے چند خوابوں کو ٹوٹتا دیکھ کر اُسے اپنی زندگی سے وحشت ہونے لگ گئی تھی۔ لیکن محبت بھی کیا اعلیٰ چیز ہے۔۔۔۔ بڑی سے بڑی سے قربانی دلا دیتی ہے اور مارو نے بھی شوہر کی محبت میں اپنے خوابوں کی قربانی دے ڈالی۔ وہ چاہتی تو عبدل سے اپنا حق مانگتی وہ حق جس کے لیے کوئی اپنا گھر چھوڑ کر ایک نئے گھر میں آ کر بستی ہے لیکن اسے عبدل سے کوئی شکوہ نہ تھا۔ ویسے بھی محبت والے شکوے کہاں کرتے ہیں۔

دن اور رات آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے مہینوں میں بدل گئے اور مہینے مل کر سالوں میں تبدیل ہو گئے۔ اب ان کی شادی کو ایک سال ہونے والا تھا عبدل نے حالات کے ٹھنڈے پڑ جانے کے بعد اب اس ملک سے ہجرت کا ارادہ کر لیا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد عبدل نے گھر کی چھت پر مارو کو آنے کا کہا اور جب وہ آ گئی تو وہ دونوں نجانے کتنی دیر خاموش رہے پھر عبدل نے بات شروع کی:

"مارو! ہمیں اب جانا ہوگا اس ملک سے، اس دھرتی سے، اس۔۔۔۔

اب ہمارے پاس یہاں رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔"

مارو نے شوہر کی اطاعت کے برعکس کچھ توقف کے جواب دیا:

"عبدل! ہمیں ہم فی الحال کہیں نہیں جائیں گے کیوں کہ میں۔۔۔۔۔"

اور پھر وہ چپ ہو گئی۔

عبدل نے اس کو اپنی بات پوری کرنے کو کہا اور پھر مارو نے کچھ شرم اور ہچکچاہٹ سے کہا کہ وہ۔۔۔ او وہ۔۔۔ او وہ ماں بننے والی ہے۔ اور وہ چاہتی ہے کہ اس کا پہلا بچہ اپنے وطن کی فضا میں سانس لے۔

عبدل کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ آج اسے بہت عرصے بعد کوئی خوشی کی بات سننے کو ملی تھی۔ خوشیاں بہت سوں کو ملتی ہیں لیکن زیادہ دیر کے لیے بہت کم لوگوں کو راس آتی ہیں۔ اگلے روز اسے خبر ملی کہ وزیر کو اس کی خبر ہو گئی ہے اور اس کے گھر چھاپا پڑنے والا ہے۔ یہ سن کر عبدل جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا کہ وہ جلد از جلد وہاں سے روانہ ہو سکے۔

مارو کی طبیعت صبح سے خراب تھی۔ رات کے دوسرے پہر وہ درد زہ سے کراہنے لگ گئی۔ عبدل نے جیسے تیسے کر کے دائی کا بندوبست کیا اور پھر صحن میں آ کر ٹہلنے لگ گیا۔ کچھ دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور اندر سے دائی بولی۔

عبدل! اپنی بیوی اور بچے کے لیے دعا کر اب اسے خدا کے علاوہ کوئی نہیں بچا سکتا ہے۔ عبدل یہ سن کر آسمان کی جانب دیکھ کر نجانے کس کو گھورنے لگا۔ اب وہ جلد از جلد وہاں سے نکلنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا اس نے گھوڑوں پر سامان لادا اور پھر کمرے کے باہر زانوں بیٹھ گیا جیسے کوئی سائل کسی در پر مانگنے کے لیے بیٹھتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد دروازہ کھلا اور دائی عبدل کو صحن میں لے گئی اور (بقیہ صفحہ نمبر ۹)

چھ سال پہلے کی بات ہے جب میری عمر تقریباً بارہ مطالعہ کر رہا تھا کہ میرا چھوٹا بھائی بنیامین روتا، آنکھیں ملتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ حالت کچھ یوں تھی گویا زبانِ حال سے کہہ رہا ہو:

ہماری دیکھ تو اب حالتِ رفو کیا ہے۔۔؟؟

گھر میں داخل ہوتے ہی آسمان سر پہ اٹھا لیا کہ ”مجھے لڑکی نے مارا ہے۔“ میری ”برادرانہ شفقت“ بیدار ہوگئی، فوراً آگ بگولہ ہوگیا، حالانکہ کوئی دن ایسا نہ گزرا ہوگا جب میں نے خود اس کی پٹائی نہ کی ہو۔ بہر حال میں تیزی سے اس کی جانب لپکا: ”کیا ہوا بھائی۔۔۔؟ کس نے مارا ہے۔۔؟ کیوں مارا ہے۔۔؟ کہاں ہے وہ۔۔؟“ میں نے ایک ہی



میرا جرم کیا ہے؟

محمد شاہد۔ ڈیرہ اسماعیل خان

شاہد صاحب اپنے جرم سے ناواقف ہیں۔ حالانکہ خود اسے بیان بھی کرر ہے ہیں۔ مزاح اور شرارت سے بھرپور ایک فکاہیہ تحریر

سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔ بھائی نے جواب میں صرف دروازے کی جانب انگلی اٹھا دی: ”وہ۔۔وہ رہی۔۔۔“

میں بغیر چپل پہنے دروازے کی جانب دوڑا، وہاں پہنچا تو ابھی تک وہ لڑکی باہر کھڑی تھی گویا ”ھل من مبارز“ کا نعرہ لگا رہی ہو۔ صنفِ نازک کے بارے میں میرا خیال تو یہ ہے کہ ”مکھی پر کلہاڑا مارنے کی کیا ضرورت۔۔؟“ لیکن جب اس نے میرے تھپڑ کا جواب مکے سے دیا تو میرا ”گمان“ کرچی کرچی ہوگیا۔ یہ تو رستم پہلوان سے بھی ایک قدم آگے نکلی، بس پھر کیا تھا۔۔۔۔ وہ تو پہلے سے ہی بپھری ہوئی تھی میں بھی بپھر گیا۔۔۔۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے، وہ مسلسل میرے چہرے پر پنجے مارتی رہی اور میں بھی دیر تک اس کے بالوں سے لٹکتا رہا، آخر تھی تو وہ بھی عورت۔۔۔ کب تک برداشت کرتی۔۔۔۔۔ ”ہائے اللہ!“ کی چیخیں نکلنے لگیں، میں نے جب یہ منظر دیکھا تو گھبرا گیا اور گھر کو واپس لوٹ گیا کیوں کہ مجھے یقین تھا کہ اب اس کے بڑے بھائی نکلیں گے۔۔ اور پھر ہوا بھی یوں میں گھر میں داخل بھی نہ ہوا تھا (بقیہ صفحہ نمبر ۱۱ پہ)



لطیفہ کہانی

انٹرویو

(دوست محمد ۔ ڈیرہ اسماعیل خان)

ایک دفعہ ایک شخص انٹرویو دینے کے لیے گیا تو اس سے انٹرویو لینے والے نے چند سوالات پوچھے، جو کچھ اس طرح کے تھے:

سوال نمبر۱: ”ایک جہاز میں پانچ سو اینٹیں لدی ہوئی تھیں۔ایک نیچے گر گئی تو باقی کتنی رہ گئیں؟“

امیدوار: ”چار سو ننانوے باقی رہ گئیں۔“

انٹرویو لینے والا: ”جواب صحیح ہے۔“

سوال نمبر۲: ”ایک ہاتھی کو ڈیپ فریزر میں تین سٹیپ میں کس طرح رکھیں گے۔“

امیدوار: ”فریزر کھولیں گے۔ہاتھی کو اندر رکھیں گے اور فریزر کو بند کر دیں گے۔“

انٹرویو لینے والا: ”جواب صحیح ہے۔“

سوال نمبر۳: ”ایک ہرن کو چار سٹیپ میں فریزر میں کس طرح رکھیں گے۔“

امیدوار:”فریزر کھولیں گے، ہاتھی کو باہر نکالیں گے، ہرن کو اندر رکھیں گے اور فریزر کو بند کر دیں۔“

انٹرویو لینے والا: ”جواب صحیح ہے۔“

سوال نمبر۴: ”جنگل کے بادشاہ شیر کی سالگرہ ہے، سب جانور گئے مگر ایک نہیں گیا۔بتاؤ وہ کون سا جانور ہے؟“

امیدوار: ”ہرن۔کیوں کہ وہ فریزر میں بند تھا۔“

انٹرویو لینے والا: ”جواب صحیح ہے۔“

سوال نمبر۵: ”ایک بڑھیا جنگل میں جا رہی ہے۔راستے میں جھیل آ گئی۔اس میں خونخوار مگر مچھ رہتے ہیں۔بڑھیا جھیل کیسے پار کرے گی؟“

امیدوار: ”آسانی سے پار کر لے گی کیوں کہ سارے مگر مچھ بادشاہ کی سالگرہ میں گئے ہوئے ہیں۔“

انٹرویو لینے والا: ”جواب صحیح ہے۔“

سوال نمبر۶: ”بڑھیا جھیل عبور کرتے ہوئے مر گئی۔کیسے؟“

امیدوار: ”پاؤں پھسل گیا ہوگا۔ڈوب کے مر گئی ہوگی۔“

انٹرویو لینے والا: ”جی نہیں! جواب غلط ہے۔وہ اینٹ جو جہاز سے گری تھی بڑھیا کے سر پر لگی اور بڑھیا مر گئی۔آپ نوکری کے نااہل قرار پائے ہیں۔آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔“

ھنسی کا فوارہ

☆راہگیر فقیر سے: ''تم بھیک کیوں مانگتے ہو؟''

بھکاری: ''یہ جاننے کے لیے کہ دنیا میں کتنے کنجوس ہیں''

☆ایک شخص کو آئینہ پڑا ملا، اس نے اٹھا کر اس میں دیکھا تو اپنی صورت نظر آئی ۔آئینہ فوراً وہیں رکھ دیا اور بولا:

''معاف کیجیے گا مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ آپ کا ہے۔''

(انیق اطہر ۔ لاوہ)

☆ ٹکٹ چیکر مسافر سے: ''آپ بغیر ٹکٹ کے ریل گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہیں۔''

مسافر: ''یہ لیں کھڑا ہو جاتا ہوں۔''

(فاروق عزیز ۔ وزیرستان)

☆ایک آدمی: ''جناب میں آج کل قائداعظم کی تصاویر جمع کر رہا ہوں۔کیا آپ اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے ہیں؟''

دوسرا آدمی: ''جی فرمائیں! میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

پہلا آدمی: ''جیب میں اور گھر میں جتنے کرنسی نوٹ ہیں مجھے دے دیں۔''

(محمد طیب ۔ چکڑالہ)

☆دکان دار: ''آپ لال بیگوں کے لیے یہ پاؤڈر لے جائیں۔''

گاہک: ''نہیں بھئی! آج میں پاؤڈر لے گیا تو کل کو وہ لپ اسٹک کی فرمائش کریں گے۔''

☆ گاہک بیرے سے: ''یہ دیکھو-----!شوربے میں مکھی تیر رہی ہے۔''

بیرا: ''لیکن جناب ! آپ یہ بھی تو دیکھیے کس قدر خوبصورتی سے تیر رہی ہے۔''

اکرم: ''میں اپنی زندگی کا مشکل ترین کام ہمیشہ ناشتے سے بھی کر لیتا ہوں۔''

راشد (حیران ہو کر): ''وہ کیا؟''

اکرم: ''بستر سے اٹھنا۔''

(عبدالودود احمد ۔ ڈھوک مصاحب)

دو دوست سفر پر گئے راستے میں رات ہو گئی۔وہ خیمہ لگا کر سو گئے۔آدھی رات کے وقت ایک کی آنکھ کھلی۔اس نے دوسرے کو جگا کر پوچھا: آسمان کی طرف دیکھ کر بتاؤ تمھیں کیا نظر آرہا ہے؟''

دوسرا دوست: ''بہت سے ستارے----''

پہلا دوست: ''اس سے کیا پتا چلا؟''

دوسرا دوست: ''یہ کہ آسمان بہت خوبصورت ہے۔''

پہلا دوست: ''بے وقوف! جاہل! اس سے یہ پتہ چلا کہ کوئی ہمارا خیمہ لے گیا۔''

استاد: ''گلاس جب ٹوٹتا ہے تو کیسی آواز آتی ہے؟''
ایک شاگرد: ''کرچ کی آواز آتی ہے۔''
دوسرا شاگرد: جی نہیں چھچ کی آواز آتی ہے۔''
تیسرا شاگرد: ''جی نہیں امی کی آواز آتی ہے: کم بخت! گدھے! اب کیا توڑ دیا ہے؟''

(حسنین حبیب ۔ ٹیکسلا)

ایک آدمی کی بیوی بے ہوش ہوگئی۔لوگوں نے اسے مردہ سمجھ کر غسل دے کر کفنایا اور قبرستان کی طرف لے گئے۔ رستے میں چارپائی ایک کھمبے سے ٹکرائی اور اس کی بیوی ہوش میں آکر اٹھ بیٹھی۔ایک سال کے بعد اس کی بیوی سچ مچ میں مرگئی۔جنازہ اٹھا تو سب لوگ کہہ رہے:
''کلمہ شہادت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔'' شوہر کہہ رہا تھا: بھائی کھمبا بچا کر ۔۔۔۔۔ کھمبا بچا کر ۔۔۔۔۔۔''

(امیر حمزہ ۔ سکا)

ایک دوست: ''حیرت ہے، تمہاری اپنی بیوی سے کبھی لڑائی نہیں ہوئی، یہ کیسے ممکن ہے؟''
دوسرا دوست: ''بہت آسان نسخہ ہے۔آدھے دن اس کے جی میں جو آئے، وہ کرتی ہے۔اور باقی آدھے دن میں ہر وہ کام کرتا ہوں جو اس کے جی میں آئے۔''

(عادل نواز ۔ تلہ گنگ)

خطرناک چارپائی

''چارپائی کی خطرناک قسم وہ ہے جس کے بچے کھچے اور ٹوٹے بانوں میں اللہ کے برگزیدہ بندے اپنی قوت



ایمانی کے زور سے اٹکے رہتے ہیں۔اس قسم کے جھلنگے کو بچے بطور جھولا اور بوڑھے آلہ ءِ تزکیہء نفس کی طرح استعمال کرتے ہیں۔اونچے گھرانوں میں تو اب ایسی چارپائیوں کو تو غریب رشتہ داروں کی طرح آڑے وقت کے لیے کونوں کھدروں میں چھپا کر رکھا جاتا۔خود مجھے مرزا بیگ کے ہاں ایک رات ایسی ہی ایک چارپائی پر ایک رات گزارنے کا اتفاق ہوا۔اس پر لیٹتے ہی اچھا بھلا آدمی نون غنہ بن جاتا ہے۔''

(مشتاق احمد یوسفی: چراغ تلے)

(انتخاب: محمد عزیر ۔ رحمٰن آباد)

برتنوں کی پاکی



راجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں پنجاب پر سکھوں کی حکومت تھی۔ رنجیت سنگھ جنگجو طبیعت کا مالک تھا۔ ایک دن بہت سارے سکھ اکٹھے ہو کر رنجیت سنگھ کے دربار میں حاضر ہوئے اور شکایت کی کہ "مسلمان صبح کو جو اذان دیتے ہیں اس سے ہمارے برتن ناپاک ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کو ایسا کرنے سے روکا جائے۔"

رنجیت سنگھ نے ایک انوکھا حکم جاری کیا: "مسلمانوں کو ایسا کرنے سے روکا جائے گا اور اس کے لیے یہ کیا جائے گا کہ جتنے سکھ یہاں شکایت لے کے آئے ہیں وہ صبح سویرے اذان کے وقت ڈیوٹی دیں گے اور مسلمانوں کو جگائیں گے۔"

سکھوں پر تو جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ روزانہ ان کو مشقت کرنا پڑتی۔ نمازیوں مساجد میں بہت زیادہ ہوگئی، کچھ دنوں بعد رنجیت سنگھ کے سامنے سکھوں نے ہاتھ جوڑ لیے اور کہا: "آپ اپنا حکم واپس لے لیں مسلمانوں کو اذان دینے دیں۔ اب ہمارے برتن ناپاک نہیں ہوں گے۔"

(انتخاب: محمد عمار ۔ ایبٹ آباد)

شاعر کی حقیقی عظمت

(راجہ فتح خان ۔ لاوہ)

"یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شاعر اور اس کے کلام کے رتبہ کا اندازہ اس کے کلام کی قلت اور کثرت سے نہیں ہوتا بلکہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اس کے منتخب اور برگزیدہ اشعار کس درجے کے ہیں۔ میر کی قدر لوگ اس لیے نہیں کرتے کہ اس نے متعدد ضخیم دیوان چھوڑے ہیں بلکہ صرف اس کے منتخب اشعار نے، جو تعداد میں نہایت قلیل ہیں اس کو تمام ریختہ گو شاعروں کا سرتاج بنا دیا تھا۔"

(مولانا الطاف حسین حالی: یادگار غالب، صفحہ ۱۱۵)



القدس

اسامہ یعقوب۔ ھری پور

القدس (فلسطین کا دارالحکومت) متمدن دنیا کا قدیم ترین شہر ہے۔ یہ ۳۵ درجہ طول شرقی اور ۳۱ درجہ عرض شمالی پر واقع ہے۔ اس کی اونچائی بحیرہ روم سے ۷۵۰ میٹر اور بحر مردار سے اس کی بلندی ۱۱۵۰ میٹر ہے۔ اس مقدس شہر کو ہزاروں (بلکہ لاکھوں) جلیل القدر انبیاء کی جبین اقدس کا بوسہ لینے کا شرف حاصل ہے۔ دنیا کے تین عالمی مذاہب (اسلام، مسیحیت اور یہودیت) کے پیروکار اس شہر کو تقدس و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی ﷺ کی معراج کی پہلی منزل کے طور پر منتخب فرمایا۔ یہیں قبہ صخرہ اور مسجد اقصیٰ بھی ہے۔ جسے مسلمانوں کا قبلہ اول ہونے کا شرف حاصل ہے۔ جس کی تعریف و توصیف کے لیے قرآن کے یہ الفاظ کافی ہیں:

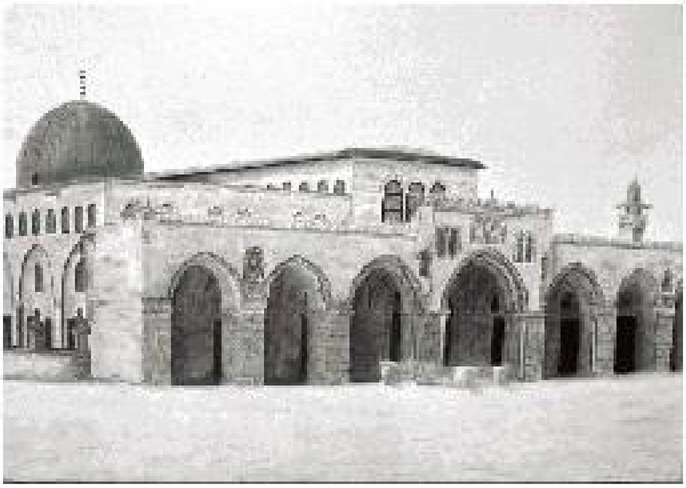
"المسجد الاقصی الذی بارکنا حوله" (الاسراء - ۱)

"مسجد اقصیٰ جس کے گردوپیش کو ہم نے بابرکت بنایا ہے۔"

مسجد اقصیٰ ہی کے اردگرد کا وہ مبارک ماحول ہے جسے ہزاروں انبیاء کی جائے ولادت اور تین آسمانی کتابوں (تورات، زبور اور انجیل) کی جائے نزول ہونے کا شرف حاصل ہے۔

عام طور پر مشہور ہے کہ مسجد اقصیٰ کی پہلی تعمیر حضرت داود علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے کی، مگر یہ درست نہیں۔ بخاری شریف میں حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی صحیح روایت موجود ہے کہ بیت اللہ اور مسجد اقصیٰ کی تعمیر میں چالیس سال کا فاصلہ ہے۔ بیت اللہ کی تعمیر ابتدائے آفرینش میں حضرت آدم علیہ السلام نے بحکم الٰہی کی تھی۔ (حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہی کی قائم کردہ بنیادوں پر تعمیر نو کی تھی) اس حساب سے بیت المقدس کی اولین تعمیر سیدنا داود و سلیمان علی نبینا و علیہما الصلوٰۃ والسلام سے بہت عرصہ قبل ہو چکی تھی۔

ہزار ہا سال تک اس مقدس سرزمین کی تولیت اور وراثت یہود ونصاری کے سپرد رہی۔لیکن آخر کار مسلسل نافرمانی، بدعہدی اور سرکشی کے نتیجے میں اللہ تعالی نے اپنی ازلی سنت کے تحت انہیں معزول کر کے امت محمدیہ علی صاحبھا



الصلوۃ والسلام کو اس مقدس سرزمین کی وراثت وتولیت سونپ دی۔

تورات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہودیوں کو فلسطین کی سرزمین کی وراثت اس شرط پر ملی تھی کہ وہ اللہ تعالی کی اطاعت اور فرمانبرداری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑیں گے۔اجونہی وہ اس معاملے میں غفلت یا سستی کا مظاہرہ کریں گے انہیں فلسطین کی وراثت سے محروم کردیا جائے گا۔چنانچہ تورات میں ہے:

"اگر تو اس شریعت کی ان سب باتوں پر اس کتاب میں لکھی ہیں احتیاط رکھ کر اس طرح عمل نہ کرے۔۔۔۔۔تو خدا تجھ پر عجیب آفتیں نازل کرے گا۔اور تیری اولاد کی آفتوں کو بڑھا کر بڑی اور دیرپا کردے گا۔۔۔۔۔اور تم اس ملک سے اکھاڑ دیئے جاؤ گے جہاں تو اس پر قبضہ کرنے کو چلا ہے۔"

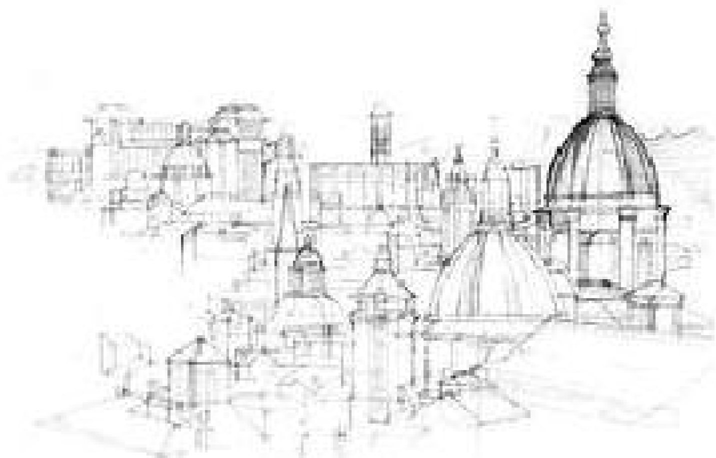
(تورات، کتاب یرمیاہ، باب ۷، آیت ۱۳ ۔ ۱۵)

اسی طرح تورات کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہود کو ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے یروشلم سے نکالا جا چکا ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے اس کی وراثت سے محروم ہو چکے ہیں:

"اور خداوند یوں فرماتا ہے کہ اب چونکہ تم نے یہ سب کام کیے ہیں۔میں نے بروقت تم کو کہا اور تاکید کی پر تم نے نہ سنا۔میں نے تم کو بلایا پر تم نے جواب نہ دیا۔اس لیے میں اس گھر سے جو میرے نام سے کہلاتا ہے، جس پر تمہارا اعتماد ہے، سے نکال دوں۔"

(تورات، کتاب استثنا، باب ۲۸، آیت ۵۸ ۔ ۶۴)

یہ انتہائی کرب اور بے حد دکھ کا مقام ہے کہ آج ہماری شامت اعمال کے سبب یہ مبغوض اور مردود قوم مسجد اقصی کے سیاہ سفید کی مالک بنی بیٹھی ہے۔مگر ہماری بے حسی اور سنگدلی کا یہ عالم ہے کہ ہم ادھر سال میں ایک مرتبہ واقعہ معراج پر گفتگو کرنے کو، شب معراج میں نوافل کی فضیلت کو لمبی چوڑی تقریروں میں بیان کرنے کو، بڑے بڑے جلسے اور محفلیں قائم کرنے کو، اس دن میں مساجد کی سج دھج کو کافی سمجھ بیٹھتے ہیں جبکہ دوسری طرف اسی روز مسجد اقصی کی فضا (بقیہ صفحہ نمبر ۱۸)



حسن نگر

مقسوم وجدان آبادی

بلدیہ کا اجلاس جاری تھا۔ خلاف معمول کوئی بھی کارکن غیر حاضر نہ تھا۔ بحث ہو رہی تھی کہ شہر کے مشہور چاندنی بازار میں موجود زنان بازاری اس شہر کی عاقبت کے لیے خطرہ ہیں۔

ایک معمر رکن اٹھے اور دھڑلے سے بولے: ''صاحبان! میں عرصہ دراز سے اس شہر میں رہ رہا ہوں۔ اس وقت حُسن بازار کا کام بالکل ٹھپ تھا مگر رفتہ رفتہ زمانہ ترقی کرتا گیا اور زنان بازاری کا کام عروج پر آگیا اب یہ ہمارے شہر کے لیے خطرہ ہیں۔ آخر کو تا بجرا بازار ہے۔ کوئی لوگ یہاں سے گزرتے ہیں او تو او وہ معصوم بچے، بچیاں جو صبح کے وقت یہاں سے مکتب کی جانب چلتے ہیں ان کے ذہنوں کا رُخ بھی بگڑ جاتا ہے۔''

''جی ہاں! میں شوکت صاحب سے بھرپور اتفاق کرتا ہوں۔'' ایک اور رکن بلدیہ کھڑے ہوئے۔ ''ابھی چند برس پہلے کی بات ہے ہمارے شہر کے بچے تعلیم میں ہمیشہ فائق تھے مگر اب وہ تعلیم سے متنفر ہو گئے ہیں۔'' ان کا نتیجہ صفر پہ آگیا ہے۔ ایک اور رکن جو ہیڈ ماسٹر بھی تھے بول پڑے۔

بہرحال کافی دیر تک یہ مسلہ زیر بحث رہا چنانچہ صدر بلدیہ اٹھے اور کہنے لگے: ''صاحبو! مجھے معلوم ہے کہ ان بے سواؤں کی وجہ سے ہمارا معاشرہ بگڑ رہا ہے مگر بات یہ ہے کہ اگر ہم انہیں اس کام سے منع کر دیں تو ان کا معاشی نظام ٹھپ ہو کر رہ جائے گا۔''

" مگر ہم انہیں شہر بدر تو کر سکتے ہیں کم از کم ہمارے شہر کا ماحول اور فضا تو خراب نہ ہو" ایک اور رکن بول پڑے۔

''اور اگر آج ان کے حمایتی اور چارہ سازوں نے ٹانگ اڑائی تو؟'' سوالیہ انداز میں صدر بلدیہ نے ایک اور نکتہ اٹھایا۔

"مسلہ نہیں بنے گا۔ ہم انہیں شہر سے باہر ایک بستی مہیا کر دیں گے بالکل الگ تھلگ" شوکت صاحب بولے

کچھ دیر تک بحث کے بعد شوکت صاحب کی تجویز کو منظور کر لیا گیا۔ مسلہ ان بے سواؤں کو منانے کا تھا۔ بالآخر چند لالچ اور نئے مکانات (تعمیر شدہ) کا وعدہ کر کے انہیں راضی کر لیا گیا۔ جس بستی کو چنا گیا وہ شہر سے پانچ کوس دور تھی۔ چار کوس تک پکی سڑک تھی آگے کوئی کوس بھر کا فاصلہ تھا۔ یہ جگہ بالکل گنجان آباد تھی۔ عرصہ ہوا مکانات کھنڈرات میں تبدیل ہو گئے تھے۔ اب تو لوگ اس بستی کے راستے سے بھی کنی کترا کر گزر جاتے تھے۔ چند راج مزدوروں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ تعمیراتی کام کے دورانیے میں ان بے سواؤں کو شہر میں رہنے کی اجازت دی گئی۔

☆☆☆☆

پہلے پورا ایک دن پرانا ملبہ صاف کرنے میں لگا۔ دوسرے دن ٹھیکیدار نقشہ لے آیا جس کے مطابق مکانات کی تعمیر ہوتی تھی۔ ٹوٹل چودہ

مکانات تھے۔ سات ایک جانب اور سات دوسری جانب۔ درمیان میں ایک راہداری رکھ دی گئی۔ گھاس کا ایک خوبصورت قطعہ بنایا گیا۔ تعمیر شروع ہو گئی۔ سنگ مرمر کا استعمال کیا گیا۔ وہاں پہ ایک ٹوٹی پھوٹی مسجد بھی تھی۔ راج مزدوروں نے عملے اُس کی تھوڑی بہت مرمت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کام میں کسی نے اعتراض نہ کیا۔ آخر کار مسجد کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ مزدور وہاں پر تھے تو ایک بڑھیا ایک چھوٹے سے نوعمر لڑکے کو ساتھ لئے ایک پیڑ کے نیچے آ بیٹھی اور سگریٹ کے پیکٹ، بیڑی اور مشروبات بیچنے لگی۔ چند دنوں بعد ایک خوانچے والا بھی آ گیا جو مختلف انواع، اقسام کی سوغاتیں آوازیں لگا کر بیچتا تھا۔ ایک بساطی نے بھی ادھر کا رخ کیا۔ راج مزدور اسی مسجد میں نماز پڑھنے جاتے تو ایک کو امامت کے لئے آگے کر دیا جاتا۔ ایک مولوی صاحب کو معلوم ہوا تو وہ بھاگم بھاگ یہاں آ گئے کہ نماز پڑھانے کی خدمات سرانجام دی جائیں۔ مکانات کے نیچے 4,4 دکانیں بنانے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔

☆☆☆☆

مکانات جب نصف سے زیادہ تعمیر ہو چکے تو ایک دن مزدور نماز پڑھنے کے بعد ستانے کے لیے گھاس کے قطعے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک آواز سنائی دی: ''حق۔۔۔۔حق۔۔۔'' مزدوروں نے تجسس سے مجبور ہو کر آگے جا کر دیکھا تو ایک ٹوٹے پھوٹے مزار کے باہر ایک فقیر کو کھڑے پایا۔ فقیر نے بتایا کہ یہ اس کے مرشد کڑک شاہ کا مزار ہے۔ کنویں سے گزرتے ہوئے فقیر نے کڑک شاہ کی چند جلالی کیفیات کا ذکر بھی مزدوروں سے کر دیا۔

☆☆☆☆

آخر کار وہ دن بھی آ گیا جب مکانات کی تعمیر مکمل ہوئی۔ بدھ کے دن کو افتتاح رکھا گیا۔ ساری طوائفیں اپنے حمایتی حضرات کے ساتھ موجود تھیں۔ کھانے کا اعلان عام کیا گیا۔ سب مزدوروں میں دو جوڑے کپڑوں کے تقسیم کیے گئے۔ کڑک شاہ کے فقیر کو نیا سوٹ زیب تن کروایا گیا۔ مولوی صاحب کی تنخواہ مقرر کی گئی۔ بے سہاروں کے لئے جلد ہی سکول کھولنے کا اعلان کیا گیا۔ اب مسئلہ تھا دکانوں کو کرائے پر چڑھانے کا۔ چنانچہ پہلی دکان اسی بڑھیا نے خریدی جو پہلے دن بیڑیاں بیچتے پیڑ کے نیچے بیٹھی رہی تھی۔ بڑھیا اپنے لڑکے کو بھی ساتھ لائی تھی۔ دکان کے بھرنے کے لئے بڑھیا نے سگریٹ کے خالی پیکٹوں کو شیلفوں میں سجا دیا۔ اور کیلے، سیب، آم اور انگور کا رس بھی بوتلوں میں بھر دیا۔ دکان کا مکمل سامان 18 سگریٹ کی ڈبیوں، آدھے درجن بیڑیوں کے بنڈل، ڈیڑھ درجن مشروبات کی بوتلیں اور تقریباً نصف درجن کینڈیا سی پر مشتمل تھا۔ دوسری دکان میں ایک بنیا آ کر آباد ہو گیا جگہ زیادہ تھی چنانچہ ایک پھول والے نے بھی اس کے ساتھ ساجھا کر لیا۔ تیسری دکان میں ایک حکیم نے آ کر قبضہ جما لیا۔ جو ہر قسم کے شربت بیچا کرتا تھا۔ جلد ہی اسکول کی تعمیر بھی مکمل ہو گئی تو شہر سے 14 اساتذہ اور ایک ہیڈ ماسٹر کے ساتھ ایک خاکروب بھی آ گیا۔ ان کے اہل خانہ بھی انہی کے ساتھ آ گئے۔

ایک ناکام تھیٹریکل کمپنی نے جب یہ نوزائیدہ بستی دیکھی تو اپنے ٹھپ ہوتے کاروبار کو یہاں جمانے کا سوچا۔ انہوں نے مکانوں کے پیچھے موجود میدان میں اپنا آفس کھول لیا اور ایک سینما گھر والوں سے اشتراک کر لیا۔ سینما کے تعمیر ہوتے ہی اُن کی بکری شروع ہو گئی۔ بستی والوں کے لیے ٹکٹ کی قیمت کافی کم رکھی گئی تھی اسی وجہ سے یہاں بہت رش ہوتا تھا۔ رش سے مجبور ہو کر سینما گھر والوں نے تھیٹریکل کمپنی سے رابطہ کر کے ان کے تھیٹر کو سینما کی شکل دینی چاہی مگر کمپنی کے مالک نے بذاتِ خود ایک سینما کھولنے کا ارادہ کر لیا۔ اس طرح دو سینما ہو گئے۔

سینما کے پچھلے دروازے پر ایک بساطی نے چھپ چھپاتے ڈرگز اور چرس بیچنے کا گھناؤنا کام شروع کر دیا اور اس کے بعد لازمی طور پر ڈاکٹر کی ضرورت پڑی۔ چنانچہ ایک ہسپتال کی منظوری کروائی گئی۔ مخیر حضرات سے چندہ جمع کر کے دو ایمبولینس خرید لی گئیں۔ آہستہ آہستہ ایک سبزی والے نے وہاں پر اپنا ٹھیلا لگانا شروع کر دیا۔ روزانہ منڈی سے وہ تازہ سبزیاں لا کر بیچتا تھا کبھی کبھار پھل بھی خرید لاتا تھا۔ ایک دکان میں حکیم صاحب اپنے دور پار کے بھتیجے کو گھسیٹ لائے جو ایک پنساری تھا۔

ایک نانبائی نے وہاں پر ایک تندور بھی کھول دیا۔ کچھ دنوں بعد حکومت نے وہاں سے ایک ریلوے لائن بچھانے کے لیے پٹڑی گزارنے کا منصوبہ بنایا تو انتظامیہ کے کان میں بجلی کے حصول کے لیے زور لگایا گیا۔ چند ماہ بعد بجلی کی منظوری دے دی گئی اور واپڈا کا دفتر بھی قائم ہو گیا۔ ڈاک کے لیے پوسٹ آفس قائم ہی ہوا تھا کہ ایک دن اس کے باہر ہوٹل کے دو بیروں میں لڑائی ہو گئی۔ اس واقعے کے بعد پولیس کی ایک چوکی بستی کے وسط میں بنائی گئی۔

ایک دفعہ ادیب حضرات کا ایک قافلہ یہاں سے گزر رہا تھا تو اپنی تنہائی اور یکسوئی کے لیے انہیں یہ جگہ بھلی محسوس ہوئی۔ جٹ سے یہاں ڈیرے جمالئے۔ ان کے آتے ہی چند ماہنامے باقاعدگی سے شائع ہونے لگے۔ دکانیں بھر گئیں۔ کریانے کی دکانیں کھل گئیں۔ گوشت والے، سبزی والے، حجام، موچی اور کئی پیشہ ور یہاں کے بازار میں بیٹھنے لگے۔ گاڑیاں آ گئیں آمد و رفت شروع ہو گئی۔

☆☆☆☆

بیس سال گزر گئے۔ بستی شہر میں تبدیل ہو گئی۔ اب اس کی آبادی ڈھائی لاکھ سے بھی اوپر ہے۔ شہر کا نام رکھا گیا حُسن نگر۔ ویسے تو اس بھرے شہر میں کئی خوبصورت جگہیں ہیں مگر سب سے بارونق جگہ یہاں کا مرکزی بازار ہے جہاں بازار حسن لگتا ہے۔ بلدیہ کا اجلاس ہو رہا تھا ایک معمر رکن کھڑے ہوئے اور بولے: ”میرا خیال ہے زنان بازاری کو شہر سے دربدر کر دینا چاہیے یہ پتا نہیں کہاں سے ہمارے اس خوبصورت شہر میں آ گئیں؟“ اور بالآخر ایک لمبے مشورے اور بحث کے بعد ان زنان بازاری کو ایک بستی میں بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا جو شہر سے پانچ کوس دور تھی۔

مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے فرمایا:

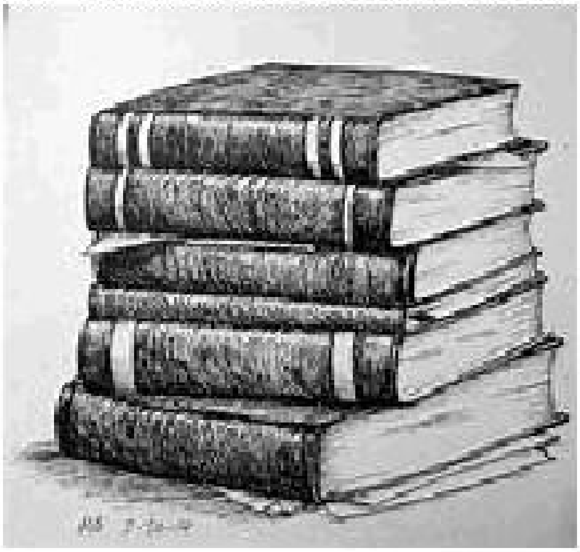
☆ ”یہ کتنی خوش نصیبی کی بات ہے کہ لوگ تو آپ کو نیک نہ سمجھیں، مگر آپ حقیقتاً نیک ہوں۔“

☆ ”خلق کی ملامت و ایذا عشق کی غنیمت ہے۔“

☆ ”متکبرین کے آگے تکبر کرنا صدقہ ہے۔“

☆ ”قیامت والے دن اللہ تعالیٰ کی رؤیت (دیدار) کا جو مرتبہ ہے، دنیا میں وہی مرتبہ نماز کا ہے۔ (یعنی آخرت میں اللہ کے قرب کا آخری درجہ یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کا دیدار کر لیں اور دنیا میں قرب کا آخری درجہ یہ ہے کہ ہم نماز ادا کر لیں۔)

☆ جس نے اپنے آپ کو بے اصل جانا وہی صحیح معنوں میں واصل (یعنی اللہ سے ملنے والا) ہے۔



آئیے قلم کے ذریعے اپنے علم و فن کے جوہر آزمائیے

☆''قلم کا سفر'' کی حیثیت ادب کی دنیا میں ایک نوزائیدہ مہمان کی سی ہے جس کی نگہداشت آپ ہی کی ذمہ داری ہے۔

☆آپ کی تحریریں اور آراء ہی ہمارے اس مجلے کو چار چاند لگائیں گی بلکہ سراپا کرن بنائیں گی۔

☆آپ کی بھیجی ہوئی ہر تحریر ہمارے لیے امید کی روشن مشعل ثابت ہوگی۔

☆آپ کا جلایا ہوا قلم کا ایک چراغ ہزاروں زندگیوں کے لیے روشنی اور نور کا سبب بن سکتا ہے تو آئیے اور اپنے حصے کا چراغ جلائیے۔

☆اپنے حاصلِ مطالعہ اور تجربات کو دوسروں تک پہنچائیے۔

☆کہانیوں، مضامین، لطائف، سائنسی معلومات اور اقتباسات کے ذریعے ''قلم کے سفر'' میں شریک سفر بنیں۔

☆تحریر کسی بھی دینی، علمی، فکری، تفریحی، ادبی، شاعرانہ، سائنسی اور صحت سے متعلق موضوع پر ہو سکتی ہے۔



تحریر بھیجنے سے قبل اطمینان کر لیں کہ:

☆تحریر ایک سطر چھوڑ کر لکھی گئی ہے۔

☆تحریر آپ نے خود لکھی ہے یا اگر کہیں سے اقتباس لیا ہے تو اس کا حوالہ بھی درج کیا ہے۔

☆تحریر آسان اور سلیس زبان میں ہے۔ گنجلک اور پیچیدہ الفاظ کا استعمال کم سے کم ہے۔

☆تحریر خوش خط یا کم از کم صاف خط میں لکھی گئی ہے۔

☆آپ کی تحریر کسی قسم کے متنازعہ اور اخلاقی موضوع پر نہیں ہے۔

☆آپ نے اپنا نام اور پتہ واضح طور پر درج کیا ہے۔ ایک سے زیادہ تحریریں ارسال کرنے کی صورت میں ہر تحریر پر نام اور پتہ درج ہے۔

☆تحریر کا مقصد اللہ رب العزت کی خوشنودی، دین اور علم و حکمت کی خدمت اور انسانیت کی فلاح و بہبود ہے۔